BROWN
BOOK ONLY

سرورق نابیادو نمبر

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

بیادگار علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، ایڈیٹر
تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند)، حامد علی خاں بی اے (نیشنل) جائنٹ ایڈیٹر

فہرستِ مضامین

جلد ۸	بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء	نمبر ۶

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	آپ اور ہم	ہم	۳۲۲
۲	دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟	"فلک پیما"	۳۲۳
۳	جہاں نما	. . . .	۳۲۴
۴	شریمتی سروجنی نائیڈو (نظم)	مولانا ظفر علی خاں اڈیٹر "زمیندار"	۳۲۸
	تصویر		
۵	مسز نائیڈو کا پیغام خواتین کو	مسز سروجنی نائیڈو پریذیڈنٹ انڈین نیشنل کانگریس	۳۲۹
۶	مسز سروجنی نائیڈو	جناب اختر دہلوی	۳۳۰
۷	اہرام مصری اور توتنخ امین کا مقبرہ	جناب مبارک علی صاحب سیالکوٹی	۳۳۹
۸	دوشیزہ فرانس	بشیر احمد	۳۴۴
۹	جذباتِ آزاد	شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد مرحوم	۳۴۹
۱۰	وظیفۂ عشق (نظم)	رائے بہادر جناب اودھ نرائن صاحب بسار یا ممبر کونسل بھوپال	۳۵۰
۱۱	آرزو (نظم)	جناب میر خورشید احمد صاحب خورشید	۳۵۰
۱۲	خیالاتِ ہمایوں	آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم	۳۵۱
۱۳	اسلوب بیان	جناب سید وقار احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)	۳۵۴
۱۴	خورشید و قمر (افسانہ)	"باغبان"	۳۵۸
۱۵	زورقِ ماہتاب (نظم)	حامد علی خاں	۳۷۹
۱۶	ادبیات		۳۸۰
۱۷	درسِ امروز (نظم)	جناب ابو الفاضل "راز" چاندپوری	۳۸۶
۱۸	نذرِ محبوب (نظم)	جناب بشیر ضیائی کوہ مری	۳۸۶
۱۹	چشم بد دور	خانصاحب میاں عبد العزیز صاحب مہتمم بندوبست	۳۸۷
۲۰	زمزمۂ عندلیب (نظمیں)	حامد علی خاں	۳۸۸
۲۱	محفل ادب		۳۹۰

ضروری اطلاع جن معاونین "ہمایوں" کا سالانہ چندہ دسمبر ۱۹۲۵ء تک ختم ہوجاتا ہے از راہ نوازش وہ سال آئندہ کا چندہ بہت جلد منی آرڈر کے ذریعہ سے بھیج دیں دوسری صورت میں انہیں جنوری کا پرچہ وی۔ پی۔ کے ذریعہ سے بھیجا جائیگا۔ اگر کسی صاحب کو آئندہ رسالہ کی خریداری منظور نہ ہو تو امید ہے کہ وہ ہمیں اطلاع دیکر دفتر کو غیر ضروری مصارف کا متحمل ہونے سے بچائیں گے۔

مینیجر "ہمایوں"
لاہور

آپ اور ہم

جیسے ہمایوں پر آپکے حقوق کا ہمیں احساس ہے ویسے ہی ہمایوں کے حقوق کا احساس آپکو ہوگا!

جو کوشش ہم ہمایوں کی ترقی کیلئے کر رہے ہیں وہ موجودہ نمبر سے روشن اور آئندہ نمبر سے روشن تر ہوتی جائیگی!

جو کوشش آپ ہمایوں کی ترقی کیلئے کر سکتے ہیں اُس کی ہمیں آپ سے توقع ہے!

آپ تو ہمایوں سے وابستہ ہیں ہی اور وابستہ نہیں تو ہمیں کامل اُمید ہے کہ جلد ہو جائینگے لیکن آپکے عزیز آپکے دوست وہ لوگ جو آپکے زیرِ اثر ہیں، وہ لوگ جن تک آپکی آواز پہنچ سکتی ہے یہ سب کے سب صرف آپکے ذریعے سے ہمایوں کے ساتھ اک مستقل تعلق پیدا کر کے آپ کی ادبی برادری میں شریک ہو سکتے ہیں۔

موجودہ پرچہ اگر آپکو پسند ہے تو اس پسند کا ہمیں بھی کچھ ثبوت دیجئے اس طرح کہ اپنے حلقۂ معاشرت میں ہمایوں کے چند خریدار پیدا کیجئے اور اگر ضرورت پڑے تو ہم سے ایک پرچہ مفت طلب کر کے اُسے اپنے دوستوں کو دکھائیے سُنائیے پڑھائیے اور ترغیب دیجئے کہ جنوری سے بلکہ ابھی سے وہ ہمارے خریدار بنجائیں، پھر ہم بھی سمجھیں کہ ہماری محنت کی طرف آپ کی توجہ ہے اور ہم ہمایوں کی ترقی کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ کریں۔

اگر موجودہ پرچہ آپکو پسند ہے تو آئندہ پرچہ یقیناً زیادہ پسند آئیگا کیونکہ ہمارا منتہائے نظر ہمایوں کو زیادہ مفید اور زیادہ دلفریب و دلکش بنانے رہنا ہے۔

آئندہ نمبر میں کیا ہوگا؟

(۱)۔ ایک سہ رنگی تصویر "زندگی کی تین راہیں" جسمیں انسان کے دل اُسکے دماغ اور اُسکے جسم کی کرشمہ زائیاں عکس ریز ہیں

(۲)۔ ایک مشہور مصنف ادیب کے قلم سے جدید ہندی ادب پر اک زبردست سبق آموز تبصرہ۔

(۳)۔ خوشی اور خوشی کے حصول پر ایک جامع علمی ادبی لطیف مضمون جسمیں یہ بتایا گیا ہے کہ خوشی کیا ہے؟ رنج و غم کا وجود کس لئے ہے؟ فکر و تشویش کے اسباب کیا ہیں؟ انسانی زندگی کو خوش و خوشتر بنانیکے عملی ذریعے کیا ہیں اور ان پر عمل کیونکر ہونا چاہیئے؟

(۴)۔ ہمایوں کے مقالہ نگار خصوصی کا ایک انوکھا ظریفانہ مضمون جس کی دِقّتِ نظر قابلِ دید ہے۔

(۵)۔ دو نہایت دلچسپ اور مختلف النوع افسانے۔

(۶)۔ بہترین معلومات و اقتباسات

(۷) ان سب کے علاوہ ملک کے بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں کے نتائج نثر و نظم کے تازہ ترین نمونے

(۸)۔ دیگر خوبیاں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ۔۔۔

اب فرمائیے کیا آپ ہمایوں کے لئے دو دو چار چار خریدار ہم پہنچا کر ہماری ہمت نہ بڑھائیں گے؟ پیشگی شکریہ قبول ہو!

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے؟

مرزا غالب کی ایک مشہور غزل کے سوالوں کا حل شاید ناظرین ہمایوں کو اور چند سوالوں کے انکشاف میں مدد دے۔

سوال۔ دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

جواب۔ ہُوا ہے خبط اور دوا ہے کام۔

سوال۔ سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے۔

جواب۔ یہیں سے ہیولیٰ یعنی کوئلہ اور روشنی چوس کر سبز رنگ اختیار کرتا ہے، پھول اسکی بےحیائی کا اشتہار ہیں سُورج کی گرمی اور سمندر کی خنکی کے دوامی ازدواج کی آوارہ گرد اولاد کا نام ابر ہے اور ہوا چند سفید چند زہریلی گیسوں کا پریشاں سا مجموعہ ہے۔ باوجود ہلکی ہونیکے اپنے بوجھ میں دبی مری جاتی ہے، دراصل نہ کہیں آسکتی ہے نہ جاسکتی ہے یونہی تھر تھر کانپتی ہے۔

سوال۔ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟

جواب۔ ڈاکٹر کا نشتر صاف بتا دیتا ہے کہ تمہیں جیسے! انکے خون کے اجزا، میں رگوں میں، ریشوں میں، ہڈیوں کی ساخت اور نشست میں باقی لوگوں سے سرِمو فرق نہیں اور ہو بھی کس طرح جب سب اولادِ بوزنہ ہیں۔

سوال۔ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

یہ بہت ٹیڑھا سوال ہے مرزا مرحوم ولی تو ضرور تھے۔ خود کہہ گئے ہیں۔ دیکھیو غالب سے گر اُلجھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا تو کیا اس پوشیدہ ولی کا اشارہ آجکل کی سیاسی کشمکشوں کی طرف تھا؟ بالکل ممکن ہے کہ پیر و مرشد نے یہ سوال انگلستان کی طرف سے ہندوستان کو مخاطب کر کے کیا ہو۔ اگر یہ قیاس صحیح ہو تو ممکن ہے کہ درست جواب صرف ایک لفظ ہو یعنی جیب

صاف ظاہر ہے کہ مرحوم نے زیادہ تر سوال اپنے زمانے کے حسبِ حال کئے۔ تو کیا آجکل کے شاعروں کا یہ فرض نہیں کہ وہ بھی ترجمانِ حالاتِ حاضرہ ہو کر آنے والی پود کے لئے کچھ سوال چھوڑ جائیں؟ اگلے سوال سب حل ہو چکے کیونکہ دلِ نادان کا زمانہ گیا اب تو ہر نوجوان مسلمان، چاہے وہ خود قطعی مہمل ہو اپنا حق سمجھتا ہے کہ اسے زردار ناز بردار حسینہ بیوی ملے۔ مگر آخر دلِ نادان کا قائم مقام آجکل کیا ہے؟ نمونے کے طور پر اور فرض پورا کرنے کے لئے غالب والی زمین میں چند سوال عرض ہیں۔ ممکن ہے پچاس سال بعد جواب مل جائیں۔

زرِ مسلم تجھے ہُوا کیا ہے
گمرہی کی تری ادا کیا ہے

گھر سے عازم تھا تو سمرنا کا
بمبئی میں یہ گھومنا کیا ہے؟

کھا گئی کیا مشین آرے کی
مثلِ منصور کٹ گیا کیا ہے

کانپور کیا حجاز و کعبہ کیا
بھولا سب ہی کا راستہ کیا ہے

ہیرے زیور کہاں سے آئے ہیں
قوم کیا چیز ہے خدا کیا ہے

خادم القوم سے حساب طلب
تو نہیں جانتا دغا کیا ہے

(فلک پیما)

جہاں نُما

ٹرکی میں انقلابات۔ قیام جمہوریت کے ساتھ ہی ٹرکی میں جس معاشرتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی گئی تھی وہ برابر ترقی کر رہا ہے۔ جدید خیال کے لوگ اس انقلاب میں بڑے بڑے خوشگوار خواب دیکھ رہے ہیں لیکن پُرانی وضع کے لوگ تاسف کے ساتھ اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ٹرکی سے مذہب کا جنازہ نکل رہا ہے فی الحال اس کے متعلق کوئی خاص رائے ظاہر نہیں کیجا سکتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ٹرکی کی موجودہ برسراقتدار جماعت مغربی طریقوں کی حد سے زیادہ دلدادہ ہے اور بمصداق "الناس علیٰ دین ملوکہم" ٹرکی کے عام باشندے بھی مغرب کی تقلید میں بہت سرگرم نظر آتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ اس سے اچھے نتائج بھی پیدا ہونگے اور بُرے بھی لیکن بعض باتوں کے متعلق تو قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اُن سے کوئی اچھا نتیجہ پیدا نہیں ہوگا اور اُنکے خلافِ اخلاق خلاف مذہب اور خلافِ اسلام ہونے میں کوئی شُبہ نہیں، مثلاً عورتوں کا نیم عُریاں مغربی لباس پہننا مردوں اور عورتوں کا مل کر نہانا یا رقص میں حصہ لینا یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں یورپ کا ایک طبقہ بھی اب قابلِ ملامت اور خلافِ اخلاق سمجھنے لگا ہے۔ یوروپین ٹوپی پہننا یا سرکاری افسروں کیلئے مغربی لباس لازم کر دینا عورتوں کو حدِ مناسب کے اندر آزادی دینا خود غرض اور جاہل مذہبی پیشواؤں کے پیدا کئے ہُوئے توہمات کا ازالہ یا درویش خانوں کا بند کرنا اور ایسی ہی دوسری باتیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر امور قابلِ ستایش اور سود مند ہیں اور اسلامی نقطۂ خیال سے بھی اُن پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، اگر ترک صرف اس قسم کی اصلاح تک اپنا کام محدود رکھتے تو کسی کو اعتراض کرنیکا حق نہیں پہنچتا تھا لیکن افسوس کہ ٹرکی میں بعض ایسے آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ اگر حالات میں تغیر برپا نہ ہُوا تو ممکن ہے کہ ٹرکی میں اسلام ایک قصۂ پارینہ رہ جائے اور یہ عریاں لباس یہ محافلِ رقص یہ مخلوط غسل اور اس قسم کی دوسری باتیں ترکوں کو اخلاقی تنزل کی گہرائیوں میں گرا دیں۔

ذیل میں ہم اسکے متعلق یورپ کے بعض اخبارات کے بیانات قلمبند کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو ان حالات کے متعلق رائے قائم کرنے میں سہولت ہو۔

"لاپریس" (پیرس) لکھتا ہے کہ سرخ ٹوپی کو ترک ہمیشہ اپنی قومی ٹوپی سمجھتے رہے ہیں لیکن در اصل یہ یونانیوں کی ٹوپی ہے جسے کم از کم چھ سو سال کا عرصہ ہُوا وہ ترک کر چکے ہیں۔ اناطولیا کے جمہوریت پسند جو اسلامی روایات

اسلامی رسم و رواج اور صدیوں کے پُرانے قاعدوں کو مٹا کر ماضی کے تمام افسانے بھُلا دینا چاہتے ہیں انہوں نے نہایت بیباکی سے اعلان کر دیا ہے کہ مُسلمان ترک جس قسم کی یوروپین ٹوپی چاہیں استعمال کریں چنانچہ آج کل ترکوں نے مختلف قسم کی مغربی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں جمہوریہ کے ایک عہدہ دار نے پیشینگوئی کی ہے کہ آج سے پانچ سال بعد اگر کوئی شخص سرخ ترکی ٹوپی پہنے ہوُئے نظر آیا تو وہ ایک اعجوبہ سمجھا جائیگا۔ عورتیں بھی مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہیں چنانچہ انہوں نے بھی برقع اور نقاب سے نجات حاصل کر کے سر پر خوش وضع مغربی ٹوپیاں پہن لی ہیں اور اب اُن میں اور یوروپین عورتوں میں امتیاز کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے البتہ بڑی بوڑھیاں اب تک نقاب استعمال کرتی ہیں ۔

گھروں میں اب "زنانہ" اور "مردانہ" کا امتیازی فرق باقی نہیں رہا۔ کم از کم ایکسال کے زمانے سے عورتیں ہر جگہ مردوں کے ساتھ آتی جاتی ہیں اور آبنائے باسفورس اور مارمورا کے ساحلوں پر عورتوں اور مردوں کو باہم مل کر نہانے کی اجازت ہے ۔

ایک اور نئی چیز مجسموں وغیرہ کا قیام ہے، ایسی چیزوں کے خلاف اب متعصبانہ خیالات باقی نہیں رہے اور ہم جلد ہی قسطنطنیہ ادانہ اور انگورہ میں مصطفٰے کمال پاشا اور اُنکے روشن خیال رفقاء کے مجسمے کھڑے دیکھیں گے جنہوں نے پانچ سال کے عرصہ میں ٹرکی کیلئے وہ کام کر دکھایا ہے جسے سُلطان پانچ صدیوں میں بھی پُورا نہ کر سکے تھے ۔

"مانچسٹر گارڈین" لکھتا ہے کہ "ٹرکی کے اخبار "وطن" کی رائے کے مطابق ترکوں کے ناموں کے ساتھ انکے خاندانی نام بھی ضرور شامل ہونے چاہئیں وہ بتاتا ہے کہ ترکوں میں ایک ہی نام کے کئی کئی لوگ پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے فوجی، عدالتی اور دوسرے سرکاری محکموں میں ہر روز بہت سی مشکلات پیش آتی رہتی ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ اخبارات میں ایک شخص امین علی بے کے متعلق کوئی واقعہ درج ہوُا۔ اور جب اس شخص کا پتا چلانیکی ضرورت محسوس ہوُئی تو دس "امین علی بے" ایسے نکلے جنہوں نے اصلی شخص ہونے سے انکار کر دیا چنانچہ اس قسم کی پریشانی سے بچنے کیلئے ترکی مدارس میں ناموں کی بجائے طلبہ کے نمبر استعمال کئے جاتے ہیں ۔

"لٹریری ڈائجسٹ" کے بیان کے مطابق "ترکی ہیئت حاکمہ نے حکم صادر کیا ہے کہ آئندہ حکومت کے تمام عہدہ دار یوروپین ٹوپی اور یوروپین لباس پہنا کریں۔ البتہ مذہبی پیشوا دستار استعمال کر سکتے ہیں مجلس نے تمام درویش خانوں کے بند کر دینے کا حکم دیا ہے شیخوں اور درویشوں سے مذہبی پیشوائی کے حقوق چھین لئے

گئے ہیں۔ "مشنری ریویو آف دی ورلڈ" کی رائے میں یہ انقلابات مغربی تہذیب کے زیر اثر ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور ان میں عیسائیوں کے خیالات اور اُنکی تقلید کا بھی بہت بڑا حصہ ہے قارئین کو یاد ہوگا کہ حکومت انگورہ نے مذہب اور سلطنت کو بالکل الگ الگ کر دیا ہے خلافت کا نظام مٹ چکا ہے اور مدارس و مکاتب کی مذہبی حیثیت باقی نہیں رہنے دی گئی"۔

تازہ اخبارات سے یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ آئندہ ٹرکی میں سنِ ہجری کی بجائے سنِ عیسوی استعمال کیا جائیگا اور جمعہ کی بجائے اتوار کے دن سرکاری تعطیل ہُوا کریگی۔

اگر یہ حالات صحیح ہیں تو ظاہر ہے کہ مصطفٰے کمال اور اُنکی برسرِ اقتدار جماعت ترکی میں "اسلامیت" کی بجائے "ترکیت" اور مغربیت کا عَلم بلند کرنیکی حد سے زیادہ مشتاق ہے اور وہ قوم جو چھ سات صدیوں تک اپنے لہو سے نخلِ اسلام کی آبیاری کرتی رہی ہے آخر اسلامی رسم و رواج سے کنارہ کش ہو رہی ہے، وہ ملک جسے ہم دار السلام کہتے تھے آج عیسائیت کی اندھا دھند تقلید کے نشہ میں سرشار ہو رہا ہے ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

حقیقی مصوّری کی خصوصیات۔ اہلِ فن کا خیال ہے کہ وہی تصویر قابلِ قدر ہوتی ہے جس میں مصوّر قدرتی اشیاء کے ساتھ کچھ اپنی طرف سے بھی شامل کر دے محض قدرتی اشیا کی تصویر کھینچ دینے سے کوئی شخص بہت بڑا مصوّر نہیں بن سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تصویر کسی ایسے جذبہ کا اظہار بھی کرے جو خود مصوّر پر کسی منظر کو دیکھ کر طاری ہُوا ہو فلسفے شاعری اور تمام فنونِ لطیفہ میں معراج کمال کو پہنچنے کا راز اسی نکتہ میں مضمر ہے۔ قدرتی اشیاء تو مصوّر کو فقط خام مسالہ کا کام دیتی ہے، اُسے چاہیئے کہ وہ انہیں حسب منشا موزوں مقامات پر استعمال کر کے ایک نئی چیز پیدا کرے۔ پھر اس چیز میں ایک ہم آہنگ موزونی پائی جائے۔ فرانس کے مشہور بت تراش رُودیں کا قول ہے کہ فنونِ لطیفہ کی بنیاد موزونی۔ اور ہم آہنگی پر استوار ہوتی ہے۔



خوش رہنا ممد صحت ہے ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان کی دماغی کیفیت کا اثر اس کی جسمانی حالت پر بھی ضرور ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خوش رہنے والے لوگ مغموم طبیعت والوں سے زیادہ تنومند اور صحت در نظر آتے ہیں غم و فکر جسم کو گھلاتا ہے اور خوشی و مسرت نہ صرف جسم میں تازگی و چستی پیدا کرتی ہے بلکہ صحت کی بھی ممد و معاون ہے ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ زیادہ غور و فکر کرنیوالے لوگوں کے چہروں پر وہ شگفتگی نہیں ہوتی جو ایسے لوگوں کے چہروں پر نظر آتی ہے جن میں غور و تفکر کا مادہ نہیں ہوتا۔ پس صحت کی درستی کیلئے لازم ہے کہ ہر شخص دن میں کسی نہ کسی وقت تفریح طبع کیلئے کسی ایسے کھیل میں شامل ہو جس سے نہ صرف اسکا بدن چاق و چوبند ہو جائے بلکہ فکر و غور سے بھی کچھ وقت کیلئے اسے نجات مل سکے ۔

سر جے سی بوس نے بنگال کی مرکزی مجلس انسداد ملیریا" کی صدارت کے دوران میں کہا کہ ملیریا کی ہلاکت خیز تباہی سے بچنے کیلئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ تفریح و تفنن کے مشاغل میں حصہ لیا جائے انہوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ میلے اور دوسرے تہوار جہاں ہر شخص زندگی کی معصوم مسرتوں میں حصہ لے سکتا تھا ملک سے سرعت کے ساتھ مٹ گئے ہیں انہوں نے اس امر پر بھی خاص طور سے اظہار افسوس کیا کہ دیسی کھیل جو ہمارے جسم کی نشو و نما کیلئے بہت ضروری تھے مفقود ہوگئے ہیں۔

انہوں نے اپنی درسگاہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دو گھنٹہ کی روزانہ ورزش سے طلبہ چست و چالاک ہو جاتے ہیں اور میرے علقے میں بیماری بلحاظ اوسط تیس فیصدی سے اُتر کر پانچ فیصدی رہ گئی ہے ۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ میری تحقیقات نے مجھے اس بات کا اور بھی قائل کر دیا ہے کہ دماغی کیفیت کا جسمانی حالت پر بہت اثر ہوتا ہے اور دماغی افسردگی سے جسم میں بھی افسردگی پیدا ہو جاتی ہے ۔

ڈاکٹر بوس کی شاعری اکثر لوگ اس خیال میں مبتلا ہیں کہ سائنس کا مطالعہ شاعرانہ خیالات کیلئے سم قاتل ثابت ہوتا ہے۔ ڈارون نے بھی یہی کہا تھا کہ حیاتیات" کی تحقیق و تدقیق نے مجھ میں شعر سمجھنے کا مادہ مطلق نہیں چھوڑا، اور مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی اگرچہ ایک حد تک یہ خیال درست ہے لیکن یہ لازم نہیں کہ ہر حال میں ایسے استثنا سے بالاتر سمجھا جائے کیونکہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سُنے گئے ہیں کہ سائنس کے مطالعہ نے ہمارے دل میں شاعری کی محبت اور قدر و منزلت بڑھا دی ہے ۔

علم نباتات کے شہرۂ آفاق ہندوستانی محقق ڈاکٹر جگدیش چندر بوس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنکا شاعرانہ انداز بیان اُنکی تحقیقات کو نہایت دلچسپ بنا دیتا ہے اور جب وہ پودوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو سامعین کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ پودے محض سبز پتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ جیتے جاگتے اجسام ہیں ۔



شریمتی سروجنی نائیڈو

آنکھیں ہوئی ہیں خیرہ سورج کی روشنی سے
مانگا بہ نور اُس نے شاید سروجنی سے

ہندوستان والو پیارا وطن تمہارا
خالی نہیں ہے اب بھی سیتا و پدمنی سے

حکمت کے جو خزانے اس خاک میں چھپے ہیں
اُن کا نشان ملا ہے ہیرے کی اک کنی سے

ہاں اے عروسِ معنی تجھ سے ہی کیوں نہ سیکھیں
نکتہ تہمتنی کا اپنی فروتنی سے

تیرا ہر اک ترانہ ہے زیست کا خزانہ
تو ہے تو ہمکو کیا ڈر دولت کی دشمنی سے

سارے چمن کے اندر اک گونج سی ہے پیدا
اے عندلیبِ شیدا تیری نوازنی سے

تیری زبان شیریں وہ کام کر دکھائے
جو ہو سکے نہ ہرگز تلوار کے دھنی سے

دامن ترا زرافشاں چھو بھی لیا ہے جس نے
اندیشہ کیا ہو اس کو گردوں کی رہزنی سے

(ستارۂ صبح)

ظفر علی خاں

———*———



شریمتی سروجنی نائیڈو

مسز نائیڈو کا پیغام خواتین کو

(ہمایوں کے ذریعے سے)

مسز نائیڈو نے میری درخواست پر اُردو میں خاص ہمایوں کے لئے اپنا یہ پیغام لکھوا دیا۔ اُنکے خیالاتِ عالیہ کے اظہار سے جیسی کہ میری توقع تھی میں بیحد متاثر ہوا لیکن اُردو میں اُنکی طرزِ زبان و بیان پر قطعی حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ اگر انگریزی کی شاعرہ ہیں تو اُردو کی ادیب کیوں نہ ہوں؟ اس سے ظاہر ہے کہ بہت سے اہلِ ذوق جنہیں ہم ادبی اُردو سے بے بہرہ سمجھتے ہیں فی الحقیقت ہماری زبان کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔

اسکے بعد کون شک کرسکتا ہے کہ اُردو ہی ہندوستان کی مُلکی زبان بن سکتی ہے کیونکہ یہی دراصل مُلکی زبان ہے!

مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اُردو زبان مکمل طور سے نہیں جانتی ہوں مگر چونکہ آپ اس طرح اصرار کرتے ہیں میں اپنی ناشستہ شکستہ زبان میں اپنے ناچیز خیالات ترقیٔ نسوان کے متعلق پیش کرتی ہوں۔

میرے خیال میں عورتوں کی تعلیم اور اُنکی اخلاقی اور اقتصادی آزادی پر ہی آئندہ تمدن موقوف ہے! اور یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ رسُولِ خدا کیطرف سے یہ بنیادی حق خواتین کو عطا ہُوا اور دُنیا کی تاریخ میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کو صریح قانونی حقوق دیئے تاکہ وہ کسی کی محتاج نہ ہوں اور خود اپنی قومی اور مذہبی ذمہ داریوں کو پورے طور سے ادا کرسکیں۔ موجودہ زمانے کی مسلمان عورتوں کے لئے زندگی کا بہترین نصب العین یہ ہے کہ وہ قدیم زمانے کی مشہور و معروف خواتین کی رُوحانی صفات اور جدید زمانے کے قابلِ تعریف تقلید خیالات و جذبات کے ملاپ کی ایک زندہ مثال بنیں۔ اُنہیں چاہیئے کہ وہ اپنے نفس بلکہ اپنی ہر حرکت در ہر جنبش میں بنظیر قدیمی شرم و حیا اور ایثار و وفا اور ساتھ ہی جدید وسعتِ نظر خود اعتمادی اور عالمگیر ہمدردی کا اظہار کریں۔

اگرچہ میں نے یہ پیغام خاص اپنی مُسلمان بہنوں کیلئے دیا ہے لیکن بحیثیت ایک ہندو عورت کے جسکی پرورش ہندو مسلم اتحاد کی آغوش میں ہُوئی ہے میں اضافہ کرتی ہوں کہ وہی نصب العین جس کا میں نے ذکر کیا ہے تمام ہندوستانی بلکہ تمام ایشیائی عورتوں کیلئے زندگی کا بہترین نصب العین ہے۔ مختصر یہ کہ مشرقی عورت کو قدیم حسن و خوبی کا خزانہ اور جدید تعلیم و تہذیب کے بہترین جوہروں کا آئینہ ہونا چاہیئے۔

مسز سروجنی نائیڈو

ہندوستان کی عام جہالت اور پستی پر جسقدر بھی افسوس کیا جائے بجا ہے لیکن اس گئی گذری حالتمیں بھی چند افراد اس سرزمین میں ایسے موجود ہیں جن پر دنیا کے مہذب سے مہذب ملک کو بھی فخر کا موقعہ ہوسکتا ہے۔ ان منتخب افراد میں مسز سروجنی نیڈو کو کئی وجوہ سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اول تو آپ ہندوستانی خواتین کے زمرہ میں شامل ہونیکی وجہ سے اُس بیزبان فرقہ کی ترجمان ہیں جو اپنے تعلیمی و معاشرتی نقائص کی وجہ سے جہالت اور پستی کیلئے ضرب المثل ہو گیا ہے۔ دوسرے اس ملک میں قومی اور مذہبی اختلاف کیوجہ سے جو فرقہ بندی اس وقت موجود ہے۔ مسز نیڈو نے اُسکی قید سے خود کو آزاد رکھکر ملک کے تمام فرقوں کی نگاہ میں اپنے ہر دلعزیز وقار کو ایسی مستقل بنیاد پر قائم رکھا ہے کہ تفرقہ کی کوئی طاقت اُسکو متزلزل نہیں کرسکتی۔ نیز اُنکے گوناگون محاسن اور اُنکی انگریزی شاعری نے اپنے ملک اور اپنے ملک والوں سے گذر کر اُنکی شہرت کا سکہ دُنیا کے دوسرے مہذب ممالک میں بھی بٹھا دیا ہے۔ اور دُنیا کے تقریباً ہر مہذب ملک میں اُنکی سحر بیانی اور ادبی کرشموں کی داد دینے والے موجود ہیں۔ فطرت نے اُنکے لئے اپنی عمومی کفایت شعاری سے انحراف روا رکھ کر اُنکو زبان اور قلم دونوں پر تصرف عطا کیا ہے اور دل و دماغ دونوں کی برکتیں اُنکی ذات میں جمع کر دی ہیں۔ ان ہی صفات کو کامل نشو و نما دینے کے لئے قضا و قدر نے اُنکو ایسے ماحول میں پیدا کیا جو کمالات علمی کے اکتساب کیلئے غایت درجہ موزون تھا۔ اُنکی پیدائش بنگال کے ایک معزز و ممتاز فرد ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیا کے گھر میں ہوئی جنھوں نے حیدر آباد دکن کی رفیع الشان اسلامی ریاست میں توطن اختیار کر کے اپنی زندگی کو تعلیم و تعلم کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اس طور پر مسز نیڈو ایک ہندو گھر میں پیدا ہوئیں لیکن ابتدا سے مسلمان گھرانوں میں اُنکی آمد و رفت میل ملاقات رہی اور دونوں جماعتوں کی معاشرتی خصوصیات سے مستفید ہونیکا موقعہ اُنکو حاصل رہا۔ اُنکے والد چونکہ نہایت روشن خیال اور علم دوست آدمی تھے۔ مسز نیڈو کی تربیت و تعلیم اس ملک کے عام رجحان کے خلاف نہایت عمدہ اصول پر ہوئی۔ انگریزی زبان اُنہوں نے بچپن ہی میں سیکھ لی اگرچہ اُنکا اپنا بیان اس امر کا شاہد ہے کہ شروع شروع میں اُنکو اس غیر زبان کو اختیار کرنے میں بہت تکلف و تامل ہوا۔ لیکن اُنکے والد کی ترغیب و راہنمائی نے آخر کار اُنکی انگریزی استعداد کو اس درجہ ترقی دی کہ ایک غیر زبان عادتِ ثانی کی حد سے گذر کر فطری زبان گئی۔ زباندانی کے ساتھ شاعری کا شوق بھی اوائل عمر ہی میں پیدا ہو گیا۔ تیرہ برس کی عمر میں نظم کا کافی سلیقہ پیدا ہو گیا اور چودہ سے سولہ برس کی عمر تک سروجنی چٹوپادھیا

نے اپنے مطالعہ کو اسقدر وسعت دی کہ انگریزی زبان کی اکثر متعارف کتابیں اُنکی نظر سے گذر گئیں۔ ۱۸۹۵ء میں جب اُنکی عمر تخمیناً سولہ یا سترہ برس کی تھی اُنکے والدین نے مزید تعلیم کی غرض سے اُنکو انگلستان بھیجدیا۔ اور نظام کی فیاض سرکار نے خاص وظیفہ عطا کر کے اس کارِ خیر میں سہولت بہم پہنچادی۔ انگلستان میں تین سال قیام رہا، اول کنگز کالج لنڈن اور اُسکے بعد گرٹن میں تعلیم پائی اور اس اثنا میں اٹلی کا بھی سفر کیا۔ یہ ملک گذشتہ دو سو سال سے فنونِ لطیفہ کے شائقین کا مرجع بنگیا ہے اور اٹلی کا سفر اکثر مغربی شعرا اور صناعوں کی ابتدائی تعلیم و تجربہ کا ایک ضروری جزو رہا ہے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس ملک کی قدرتی خوبیوں اور انسانی کرشموں نے سروجنی کی شاعرانہ طبیعت کو اُبھارنے میں ضرور مدد دی ہوگی۔ اسکے علاوہ اُنکی ذاتی کشش اور خداداد ذہانت نے انگلستان کے بعض واقفکار ادیبوں کو اُنکا گرویدہ بنا کر اُنکے لئے اپنی شاعرانہ استعداد کو ترقی دینے کے بہنظیر مواقع پیدا کردیئے۔ اُسوقت تک اُنکی شاعری انگریزی شعرا کی تقلید کی پابند رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ یہ تقلید اُنکی شاعرانہ طبیعت کے جوہرِ اصلی کو ضائع کر کے اُنکی شاعری کو انگریزی شاعری کی نقلِ محض اور انگریزی جذبات کی صدائے بازگشت بنا دے۔ لیکن یہ ادیب (جن میں ایڈمنڈ گاس اور آرتھر سائمن کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے) اس غریب الوطن اور نوعمر شاعرہ کیلئے خضرِ راہ بنگئے۔ اور اُسکو اپنے کمال کے اظہار کا صحیح راستہ دکھادیا۔ انہوں نے اُسے سمجھایا کہ زبان اور عروض کی مشکلات پر عبور حاصل کرنیکے بعد جو ہندوستانی شاعر انگریزی میں اپنے جذبات و خیالات کے اظہار پر آمادہ ہو اُسکے لئے صحیح مسلک یہ نہیں کہ دوسرے انگریزی شعرا کی کیاریوں سے گلچینی کر کے ایک خوشنما گلدستہ تیار کر دے۔ بلکہ اُس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اُسکے پھولوں میں اُسکی فطری سرزمین کا رنگ و بو موجود ہو۔ اُسکی شاعری میں ہندی جذبات کی گرمی، ہندی قلب کا تموج، اور ہندی خیالات کی تحریک ہونی چاہیئے اور اُسکی بنا اُن قدیم روحانی محسوسات و اعتقادات پر ہونی چاہیئے جو مشرق میں اُسوقت سے موجود رہے ہیں جب مغرب کو رُوح کی ہستی تک کا گمان نہ تھا۔ سروجنی نے ان نصایح کو ہونہار طبائع کی جبلی سعادتمندی کے ساتھ قبول کرلیا۔ اور اپنے کلام کے انداز کو بدل کر اسمیں وہی رنگ پیدا کرنیکی کوشش کی جسکی ان مہربان ناصحوں کے ذوقِ سلیم کو تلاش تھی۔ غرضکہ سروجنی کے قیامِ انگلستان کا بیشتر زمانہ علمی و ادبی صحبتوں میں بسر ہوا۔ لیکن صحت کی خرابی اور بعض خانگی مناقشات نے اُنکو ۱۸۹۸ء میں مراجعتِ وطن پر مجبور کیا اور اسکے چند دنوں کے بعد ڈاکٹر گوندرجلو نیڈو سے اُنکا عقد ہوگیا۔ چونکہ سروجنی کا خاندان اونچی کُل کے برہمن میں اور ڈاکٹر نیڈو برہمن نہیں اسلئے جانبین کے رشتہ دار اس تعلق کے مخالف تھے۔ اور اُسوقت غالباً اسکے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوئی ہونگی۔ لیکن آج جبکہ ذات پات کے بندھن ڈھیلے ہو گئے ہیں اور بین الاقوام ازدواج روزمرہ کی بات ہوگئی ہے ڈاکٹر نیڈو اور

سروجنی چٹوپادھیا کا بیاہ کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں اور نہ اُس پر کسی سمجھدار آدمی کو حرف رکھنے کی گنجائش ہوسکتی ہے + شاعر کی حساس طبیعت خارجی قیود کی برداشت سے قاصر ہے۔ اور جو دل عالم خیال میں اجتہاد کی کان ہو اُس سے عملی دنیا میں رسم ورواج کی خاموش تقلید کی توقع رکھنی محض خیال خام ہے +

شادی کے بعد سے لیکر آجتک سروجنی نیڈو کی زندگی ملک کی خدمت کیلئے وقف رہی ہے، اور اُنکے عملی کارنامے ہندوستان کے عہد حاضر کی تاریخ کا ایک جزو ہیں جنکی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں سماسکتی + اُنکی شاعری اُنکی زندگی کا جزو لاینفک ہے لیکن یہ وہ جزو نہیں جو کُل پر حاوی ہوجائے۔ اور میں اسکو ملک کی خوبی قسمت خیال کرتا ہوں کہ شاعری نے اُنکی قوت عمل کو کُند نہیں کردیا ہے + ہمارے ہاں تو بعض لوگ شاعری کو بیکاری کا مشغلہ تصور کرتے ہی ہیں لیکن عام طور پر شاعری اور شعراء کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر عملی دنیا میں وہ تگ و دو نہیں کرسکتے جو خیالی دنیا میں کرتے ہیں + اور اُنکی طبیعت کی جولانی واقعات سے مقابل ہونے پر سرد پڑجاتی ہے + لیکن مسز نیڈو اس اعتبار سے مستثنیات میں شمار کرنیکے قابل ہیں۔ کیونکہ اُنکی ذات ملک کیلئے مختلف النوع برکات کا سرچشمہ ہے + اگر صرف اُنکے وہی کام لے لئے جائیں جو رفاہ عام کی ذیل میں آتے ہیں۔ تو وہ کسی فرد واحد کیلئے سرمایہ زندگی بننے کو کافی ہیں + مثال کے طور پر اُس جانفشانی کو لیجئے جو اُنھوں نے موسیٰ ندی کی عظیم طغیانی کے وقت حیدرآباد میں دکھائی تھی اور جس کی داد حکومت سے قیصر ہند کے طلائی تمغہ کی شکل میں ملی تھی + یہ اُنکی بیش بہا انسانی خدمات میں سے صرف ایک خدمت ہے + اُنکی سیاسیات کی آزادانہ تنقید کا نہ راقم الحروف کو موقعہ حاصل ہے اور نہ ایک ادبی صحیفہ کے اوراق اس قسم کی بحث کیلئے موزوں ہیں + لیکن جہانتک اُنکی سیاسی جدوجہد کا منشاء اپنے ابنائے ملک کی فلاح وبہبود اور ہندوستان کی مختلف جماعتوں اور خصوصاً ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا قائم کرنا ہے۔ اُنکی کارگذاری پر کسی حق پسند شخص کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا + مسز نیڈو کی سیاسی اور معاشرتی کوشش کا سب سے قوی سامان اُنکی زبان ہے جسے قدرت نے سحر بیان عطا فرمایا ہے + اُنکی شاعری کا اثر تو صرف اُن لوگوں تک محدود رہتا جو شعر فہم ہونیکے مدعی ہیں لیکن اُنکی فصیح وبلیغ تقریر نے اُنکے بیان کی لطافت کا ہر قسم کے لوگوں کو قائل کردیا ہے + اُنکی نثر میں بھی وہی شیریں الفاظ و نزاکت خیال موجود ہے۔ جو اُنکی نظم کا خاصہ ہے۔ اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ سمجھا جائیگا کہ اسوقت ملک کا کوئی مقرر سامعین پر اثر ڈالنے کی وہ قدرت نہیں رکھتا جو اس خاتون کو حاصل ہے + ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی تقریر زیادہ مدلل ہو + لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ مسز نیڈو کی تقریر سے زیادہ دلنشین ثابت ہو + اگر تقریر کے محاسن کا وہی معیار تسلیم کرلیا جائے جو غالب نے اپنے اس شعر میں قائم کیا ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ تو کون یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ مسز نیہڈو کی تقریر تمام خوبیوں کی جامع نہیں؟ اور اگر کبھی کبھی اُنکی زمزمہ سرائی تلخنوائی میں منتقل ہوجاتی ہے تو اُسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اُنکی شاعرانہ طبیعت ناگوار واقعات کو معمولی طبائع سے بہت زیادہ محسوس کرتی ہے اور اپنے گرم احساس کو معتدل الفاظ میں اظہار کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ شاعرانہ بیان میں دائمی اعتدال وسلامت روی کی تلاش ایسی ہی لاحاصل ہے جیسی کہ یہ توقع کہ کوئی دریا اپنی روانی کو ایک خط مستقیم کا پابند کرے اور جس طرح دریا کا پانی باوجود اپنی طبعی صفائی کے خس و خاشاک سے مکدر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح شاعر کی تقریر بھی اپنی شیریں کلامی کے باوجود تلخ و تیز الفاظ سے ملوث ہو سکتی ہے۔ مسز نیڈو کی جادو بیانی اُنکی عام تقریر اور خاص گفتگو دونوں میں یکساں طور پر اپنا عمل کرتی ہے۔ جن لوگوں کو اُن سے ذاتی ملاقات کا شرف حاصل ہے وہ میرے اس قول کی تائید کرینگے کہ اُنکا معمولی سے معمولی فقرہ بھی اپنی بندش الفاظ کے لحاظ سے کسی نظم کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے اُنکی گفتگو نہ صرف ذہنی لطافتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ بلکہ اُس میں وہ خلوص اور ہمدردی بھی پائی جاتی ہے جو مخاطب کو تسخیر کر لیتی ہے۔ بعض لوگوں کی باتوں میں چمک دمک تو ہوتی ہے لیکن برف کی سی چمک جسکی سرد مہری سامع کے دل و دماغ کو منجمد کر دیتی ہے۔ اسکے خلاف مسز نیہڈو کی درفشانی خورشید کی تابندگی کے مانند ہے جو سرد سے سرد طبیعت کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ غالباً یہی اُنکی غیر معمولی ہردلعزیزی کا سب سے بڑا راز ہے کیونکہ یہی صفت ہے کہ جو ہر ایک شخص کو جسے ایک مرتبہ بھی اُن سے مُلاقات کا اتفاق ہو جائے عمر بھر کیلئے اُنکا گرویدہ اور ثنا خواں بنا دیتی ہے۔

مسز نیڈو کی شاعری بجائے خود ایک وسیع مضمون ہے، اور چونکہ وہ تمام و کمال انگریزی زبان میں ہے اسلئے اردو میں اُسکی مفصل تنقید اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ اول اُن اثرات کو واضح کیا جائے جو اُنکی شاعری کے ارتقا پر پرتوفگن ہوئے، اُسکے بعد اُنکی شاعری کا تقابل اور موازنہ دیگر انگریزی شعراء کے کلام کے ساتھ کرکے اُسکی خصوصیات کو واضح کیا جائے اور آخر میں یہ تعین کیا جائے کہ انگریزی نظم میں اُنکا کیا پایہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اُردو زبان میں ان تمام مباحث کیلئے وسعت بھی ہو تو وہ نقاد کہاں جو اُن سے کشمکش کر سکے! لہذا یہاں صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ایک اجمالی تبصرہ ناظرین کے پیشکش کر دیا جائے۔ یہ بیان اوپر آچکا ہے کہ مسز نیہڈو کو اپنے طالبعلمانہ قیام انگلستان میں اپنی علمی اور شاعرانہ استعداد کو ترقی دینے کے خاص مواقع نصیب رہے۔ انگلستان میں اُسوقت سوئن برن جیسی اور ورڈزورتھ کا اثر غالب تھا۔ اور انگریزی نظم میں نئی نئی گلکاریاں۔ اور رنگ آمیزیاں ہو چکی تھیں۔ مذکورہ بالا شعراء اور اُنکے معاصرین نے جو رنگ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اگرچہ بہت حد

تک تو اُس آفتاب شاعری کے غروب کی شفق تھا جو انیسویں صدی کے شروع میں ورڈزورتھ۔ بائرن اور شیلے کے عروج کے ساتھ طلوع ہُوا تھا لیکن تاہم موسم خزاں کی کسی سہانی شام کی مانند نظر فریب ضرور تھا۔ ان شعراء کی سعی سے انگریزی شاعری نے زبان کے اعتبار سے نئی لطافتیں اختیار کرلی تھیں اور شاعری موسیقی کے نصب العین کے قریب ہو گئی تھی تخیل کے اعتبار سے اُسکی حدود مصوری کے قریب پہنچ گئی تھیں اور فن مصوری کے اصول شاعری میں جھلکتے نظر آتے تھے شاعری کو دیگر فنون لطیفہ سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے، اور اس میں مصوری اور موسیقی دونوں کے اجزا ابتدا سے شامل رہے ہیں خصوصاً موسیقی اور شاعری کا قدیم اور قریبی رابطہ بالکل بیّن اور واضح ہے۔ لیکن اس دور کے انگریزی شعراء کی غالباً سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انہوں نے مصورانہ تخیلات کو سُریلے الفاظ میں منظوم کرنیکی خاص طور پر مہارت بہم پہنچائی تھی۔ اس میلان کا اثر ہماری شاعرہ کے کلام پر بھی پڑا۔ اور جہانتک وہ اثر مسز نیڈو کی نظموں کو فردوس گوش بنانے میں مدد دیتا ہے اُسکو مفید کہنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس اثر کا ایک مضر پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ محض سُریلے الفاظ کو شاعرانہ کلام کا مترادف خیال کر لیا جاتا ہے۔ یا پڑھنے والے کی توجہ الفاظ کے نغمہ میں اسقدر الجھ جاتی ہے کہ نظم کا مفہوم بالکل نظر انداز ہو جاتا ہے۔ شاعری کا مدعا محض ایک نغمۂ صوات کی تخلیق نہیں، اُسکا دائرہ تخلیق اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ خوش آواز الفاظ کا بڑھا ہُوا شوق بعض دفعہ شاعری کو محض لفاظی کے درجہ تک گرا دیتا ہے۔ حق پسندی کا تقاضا اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ یہ مضر اثر بھی مسز سروجنی نیڈو کی ابتدائی نظموں میں بالکل مفقود نہیں ہے۔

بادی النظر میں یہ امر کچھ کم حیرت خیز نہیں کہ کوئی ہندوستانی انگریزی میں شعر کہے۔ اصلی شاعری تمام و کمال پر فطرت پر مبنی ہے۔ اور اُس کا اظہار فطری طور پر اپنی ہی زبان میں ہو سکتا ہے۔ لیکن خواہ اسے ہنر کہئے یا عیب مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانیوں کو غیر زبانوں کے اختیار کرنے اور اُن زبانوں کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں عرصہ دراز سے ایک خاص ملکہ حاصل رہا ہے۔ مثال کے طور پر فارسی کو لیجئے۔ مسلمانوں کے عہد میں اس زبان نے وہ رواج پایا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثرت سے فارسی شعر کہنے لگے۔ اور ہندوستان کی فارسی شاعری کے متعلق شیخ علی حزیں جیسے تنگ خیال اہل زبان خواہ کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں اور بوئے کچوری ہی آید کی پھبتی اُڑائیں لیکن اس ملک کے فارسی گو شعرا کے گروہ میں چند ایسے بھی ہیں جنکے کمال کی داد ہر ایک منصف مزاج شخص کو دینی پڑتی ہے۔ عربی فارسی سے زیادہ مشکل الحصول زبان ہے لیکن نطق ہندی لحن نجدی کے اختیار کرنے سے عاجز ثابت نہیں ہُوا۔ اور متعدد ہندوستانیوں نے عربی نظم و نثر میں قابل قدر سلیقہ دکھایا ہے۔ انگریزی تعلیم کے بنگال میں رواج پاتے ہی بنگالی شعراء کو انگریزی نظم کا

شوق ہو گیا۔ اور ان میں کم از کم ۲ دو شاعر اس پایہ کے ہوئے کہ اُنکا کلام اہل زبان کی نگاہ میں بھی فصیح قرار پایا۔ ان میں سے ایک رڈیرو زیو تو مخلوط النسل ہونیکی وجہ سے انگریزی کو غالباً مادری زبان کی طرح استعمال کرتا تھا۔ لیکن مس تورودت خالص بنگالی ہونیکے اعتبار سے مسز سروجنی نیڈو کی حقیقی پیشرو تھیں۔ غرضکہ مسز نیڈو کی پیدایش سے بھی پہلے ہندوستان اور خصوصاً بنگال میں انگریزی شاعری کی رسم جاری ہو گئی تھی۔ علاوہ بریں اُنکی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو کچھ مذکور ہو چکا ہے اُسکو خیال میں رکھتے ہوئے یہ حیرت کسی قدر کم ہو جاتی ہے کہ اُنہوں نے ہندوستانی ہو کر انگریزی زبان پر ایسی قدرت کیونکر حاصل کی کہ اُسمیں اپنے شاعرانہ کمال کا اظہار کر سکیں۔ اُنکی انگریزی زباندانی کی پوری داد کوئی اہلِ زبان ہی دے سکتا ہے لیکن جہانتک ایک ہندوستانی سمجھ سکتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ محاورات اور الفاظ دونوں پر اُنکو کامل تصرف حاصل ہے اور اُنکے استعمال میں کوئی ایسی خامی یا نقص نہیں نظر آتا جو اُنکے اظہار کمال میں مانع ہو سکے۔ انگریزی شعراء کے کلام پر اُنکو پورا عبور ہے اور اُسکی ملاوٹیں اُنکے اپنے کلام کی شکر ریزی میں مدد دیتی ہیں۔ شاید میرا یہ خیال غلط نہیں کہ وہ شیلے کے کلام کی خاص طور سے دلدادہ ہیں کیونکہ اُسکے کلام میں وہ نزاکت اور لطافت ہے جو بہ نسبت عام آدمیوں کے شعرا کو زیادہ اپنی جانب جذب کرتی ہے ممکن ہے کہ ابتک جو کچھ بیان ہوا اُس سے یہ قیاس کر لیا جائے کہ مسز نیڈو کی شاعری انگریزی یا مغربی شاعری کا عکس ہے اور اسمیں مشرقی رنگ کی کوئی آمیزش نہیں۔ لیکن یہ قیاس صحیح نہیں کیونکہ اُنہوں نے مغربی شعرا کے ساتھ ساتھ مشرقی شعرا کے مطالعہ کو بھی جاری رکھا ہے اور فارسی اور اُردو زبان کے شعرا کا کلام نہایت ذوق وشوق سے سنتی ہیں اور اپنی باریک بین طبیعت سے اُس پر ایسی تنقید کرتی ہیں کہ بڑے بڑے شعر فہم محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ اُردو میں غالب کا کلام خاص طور پر آپکے مطبوع خاطر ہے اور عہد حاضر کے شعرا میں اقبال کے اشعار کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ان دونوں شعرا کی خصوصیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسز نیڈو ایشیائی شاعری کے نکات سے کس درجہ واقف ہیں۔ راقم الحروف کو علم نہیں کہ سنسکرت اور ہندی شاعری سے واقفیت بہم پہنچانیکا اُنکو کہانتک موقعہ ملا ہے۔ لیکن اُنکی اپنی شاعری کے بعض پہلو ہندی شاعری سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں جسکی کچھ تشریح بعد میں کیجائیگی۔ فی الحال اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ مسز نیڈو کی شاعری مغربیت اور مشرقیت دونوں کے اثرات سے مستفید ہوئی ہے۔

متفرق نظموں کے علاوہ مسز نیڈو ۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۱۷ء تک تین مستقل مجموعے پانچ پانچ برس کے وقفے سے شائع کر چکی ہیں۔ ان تینوں مجموعوں کے انگریزی ناموں کے ترجمے علی الترتیب اشاعت "طلائی آستانہ" "طایرِ وقت" اور "شکستہ پر" ہو سکتے ہیں اور ایک حد تک یہ نام اُن نظموں کی نوعیت کے مظہر ہیں جو اِن کتابوں میں جمع کیگئی ہیں۔ "طلائی آستانہ" میں پندرہ سے

بلکہ پچیس برس کی عمر تک کے کلام کا انتخاب ہے۔ ان نظموں میں شاعرہ نے دنیا کی دلفریبیوں کے قصر طلائی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے اور اُسے ہر ایک شئے اُس سنہری ملمع سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہے جو عنفوانِ شباب میں اشیا کے تاریک رُخ کو ہماری نگاہ سے پوشیدہ کر دیتا ہے۔ ہندوستان کے کسی قدیمی شہر اور خصوصاً حیدر آباد جیسے شہر میں بیسیوں نظارے ایسے بھی ہوتے ہیں جو شاعر کے نازک دماغ کو پراگندہ کر سکتے ہیں لیکن ابھی تک ہماری شاعرہ کی نگاہ ان ناگوار نظاروں پر سے اُچٹتی ہوئی گذر جاتی ہے اور اُسکی نظر صرف اُنہی چیزوں پر جمتی ہے جو اپنی خوشنمائی سے اُسکے دل کو خوش کر سکتی ہیں اور دل اس خوشی کا اظہار زبان سے اپنے نظموں میں کرتا ہے جو سامعہ کو ہندی ٹھمریوں سے زیادہ لذت بخشتے ہیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ خیالات میں پختگی آجاتی ہے اور شاعر کی نگاہ اشیا کی ظاہری خوشنمائی سے تجاوز کر کے اُنکی باطنی حقیقت تک پہنچنے لگتی ہے، اور اُسپر یہ حال منکشف ہوتا ہے کہ دُنیا صرف سہانے رنگوں اور سریلی آوازوں سے مرکب نہیں بلکہ اسمیں بہت سے بد نما رنگ اور کرخت سُر بھی ہیں جنکا تقابل ہمیں اپنے دلفریب خواب سے چونکا کر مجبور کرتا ہے کہ ہم اس دلق ملمع کو اُلٹ کر دیکھیں کہ اسکا اُلٹا رُخ کیسا ہے اور اس بے سرے نغمہ کو کان لگا کر سُنیں اور غور کریں کہ آیا اُسکی کوئی لَے ہے؟ "طائرِ وقت" کی نظمیں زبان و تخیل دونوں کے لحاظ سے اسکا پتہ دیتی ہیں کہ ہماری شاعرہ کے کلام میں اب وہ پختگی پیدا ہو گئی ہے جو فطرت کے غائر مطالعے سے اخذ کیجاتی ہے۔ "شکستہ پر" میں یہ صفت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس عرصہ میں شاعرہ کو بعض ایسے ناگزیر صدمات پیش آتے ہیں جن سے دُنیا میں کوئی بشر مامون نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ عمومیت کے اعتبار سے موت اور زیست سے زیادہ دنیا میں کوئی واقعہ پیش نظر نہیں رہتا لیکن کسی عزیز یا دوست کی موت اس عام واقعہ کو ایک مکاشفہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور خیال کو یہ کاوش ہوتی ہے کہ اس تغیر پذیر عالم میں اپنے لئے کوئی مستقر تلاش کرے۔ یہ تلاش ہمکو حقیقت کی طرف لیجاتی ہے اور ہمیں اپنی معصومیت کے زمانہ کے بہت سے خواب ترک کرنے پڑتے ہیں لیکن یہ نقصان انجام کار ہمیں نفع بخش ثابت ہوتا ہے کیونکہ تخیل اور عقل میں ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے جسپر شاعری کے صحیح عروج کا مدار ہے۔ اس آخری مجموعہ کا نام ہی شاہد ہے کہ اُسکے اشعار میں اُسی درد کا اظہار ہے جسے غالب نے "شکست کی آواز" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان اشعار میں روانی و صفائی ہے مگر ایسی روانی اور صفائی جو ایک آنسو کے رخسار پر بہنے کی یاد دلاتی ہے۔ انمیں نغمہ ہے لیکن وہ نغمہ جو آہ سرد کی طرح دل کے پار ہو جاتا ہے۔ خیالات کا ارتقا مسز نیڈو کی شاعری کی ظاہری شکل (یعنی بندش الفاظ اور ترکیب) میں بھی مناسب تغیر پیدا کرتا جاتا ہے، اگرچہ وہ سُریلا پن جسکا ذکر آچکا ہے اُنکی تمام شاعری میں قدرِ مشترک ہے۔ لیکن جس طرح میں نے اُنکی اولین نظموں کو ٹھمری سے مشابہت دی تھی۔ اُسی استعارہ کو قائم رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیئے کہ اُنکی آخری نظمیں خیال یا دھرپد سے مشابہ ہیں جنمیں سریلا پن، رفعت اور

شکوہ کے ساتھ نمودار ہو کر قلب کو مطمئن اور کانوں کو خوش کر دیتا ہے ٭

ہندی راگ اور مسز نیڈو کی شاعری کے درمیان جو تشبیہ قایم کیگئی ہے، وہ نہ صرف اُس شاعری کی ظاہری شکل سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ اُن جذبات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو اُسکی تہ میں پوشیدہ ہیں ٭ اسمیں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ محبت اُن جذبات میں جو شاعری کے محرک بن سکتے ہیں۔ سب سے قوی جذبہ ہے۔ اور اگرچہ اور جذبات بھی شعر کا لباس پہن سکتے ہیں لیکن یہ لباس جیسا محبت کے جسم پر راست آتا ہے، ویسا کسی اور جذبہ پر نہیں کُھلتا ٭ لیکن محبت کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ اور جو رنگ وہ ہندی شاعری (جس کے ضمن میں ہندی راگ بھی شامل ہے) میں دکھاتی ہے وہ مغربی رنگ شاعری ہمیں شاذ مثالوں کو چھوڑ کر کہیں نظر نہیں آتا ٭ مسز نیڈو کی زبان اگرچہ انگریزی ہے لیکن اُنکا دل ہندی ہے اور اُس دل میں جو جذبات ہیں وہ بھی ہندی ہیں ٭ ہندی شاعری میں محبت کا اظہار ہمیشہ عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور یہ نسوانی محبت اپنی مجازی صورتوں میں بھی اُس روحانی جذبہ سے معمور نظر آتی ہے جو اور زبانوں میں صرف مذہبی شاعری میں دکھائی دیتا ہے ٭ بلکہ ہندی شاعری میں پریم یعنی محبت اور بھگتی یعنی پرستش دونوں ایک دوسرے سے اس قدر پیوست پائے جاتے ہیں کہ ان دونوں جذبات میں کوئی مابہ الامتیاز قائم کرنا مشکل ہے ٭ مسز نیڈو کی شاعری میں جس محبت کی جھلک نظر آتی ہے وہ وہی محبت ہے جو بھگتی کی جانب لے جاتی ہے۔ جس میں روحانی رفعت اور مذہبی جوش دونوں موجود ہیں جو ہمیشہ اخلاق کے دائرہ میں محصور اور مذہب کے احکام کے تابع رہتی ہے۔ جس میں محبت کرنے والی اپنے محبوب کو ایک دیوتا اور خود کو اُس کا ادنےٰ پجاری تصور کرتی ہے۔ جو موت کے سامنے بھی سر تسلیم خم نہیں کرتی بلکہ ستی کی چتا کے شعلوں کے ساتھ غرور سے اپنے سر کو آسمان تک بلند کرتی ہے ٭ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جس محبت کو مسز نیڈو کی شاعری سراہتی ہے وہ ایک معمولی ہندی عورت کی رسمی محبت ہے جو مذہب رواج۔ ذات پات اور بیسیوں قیود سے پابند نظر آتی ہے۔ بلکہ اُس میں وہ انفرادی قوت موجود ہے جو ضرورت کے وقت ہر قسم کی قیود اور بندشوں کو توڑ سکتی ہے ٭

محبت کے علاوہ مسز نیڈو کے اشعار میں دیگر سب اعلیٰ اور ارفع جذبات اور تحریکات سے کام لیا گیا ہے ٭ حب وطن۔ شفقت مادری۔ انسانی ہمدردی غرضکہ کوئی بھی قابل قدر جذبہ ایسا نہیں جس کا اُن کی کسی نہ کسی نظم میں جلوہ نہ نظر آتا ہو ٭ قدرتی مناظر سے دلبستگی شاعرانہ طبیعت کا لازمی جزو ہے لیکن مسز نیڈو نے مناظر قدرت کو اپنی شاعری کا خاص موضوع قرار نہیں دیا۔ بلکہ ہمیشہ اُنکو انسانی جذبات

کی تصویر کے حاشیہ کے طور پر استعمال کیا ہے + البتہ ہر طبقہ اور ہر نوع کے انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کرنے میں اُنہیں خاص ملکہ ہے - اور اُن کی نظموں میں مؤذن کی اذان اور پجاری کے بھجن سے لیکر پنہاریوں کے گیت - پالکی بردار کہاروں کے گانے اور فقیر کی صدا تک سب قسم کے نغمے موجود ہیں + ایشیا کے رنگین اور نمایاں پہلو دیکھنے کا اُن کی آنکھ کو خاص ملکہ ہے، اور بسا اوقات وہ چند فقروں یا چند لفظوں میں کسی واقعہ یا نظارہ کی پوری تصویر ہماری نگاہ کے سامنے کھینچ دیتی ہیں +

ہندوستان کی عورتوں کے متعلق کبھی طنز اور کبھی حسرت کے لہجہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی زندگی صرف تین اہم واقعات پر مشتمل ہوتی ہے یعنی پیدا ہوئیں - بیاہ ہوا اور مرگئیں + کیا یہ بات بجائے خود تعجب خیز نہیں کہ ایسے درماندہ طبقہ میں سروجنی نیڈو جیسی مجموعہ کمالات خاتون کیسے پیدا ہو گئی ؟ اس کو ہم معجزہ خیال کریں یا فطری اسباب کا نتیجہ - لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ واقعہ صرف تعجب خیز ہی نہیں بلکہ اُمید افزا بھی ہے کہ اگر ہندوستانی عورتوں کو موافق حالات میسر آئیں تو وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں + یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک خاتون مسز سروجنی نیڈو کی مانند خوشگو شاعر یا خوش بیان مقرر یا سیاسی مدبر بننے کی سعی لاحاصل کرے - بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُنکی رفیع الشان مثال سے سبق لیکر وہ کارکن اور فرض شناس انسان ہو جائیں اور یہ مثال ہمارے مردوں کے لئے بھی ایسی ہی سبق آموز ہے جیسی کہ ہماری عورتوں کے لئے +

اختر دہلوی

مورخہ ۲۰، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ ہجری

--- ❖ ---

اہرامِ مصری اور توتنخ امین کا مقبرہ

اعجاز کا ہوتا ہے ہر شئے پہ گماں مجھ کو — پرواز تخیل کی لے آئی کہاں مجھ کو
ہے نطق کا طوطی اور آئینۂ خاموشی — آنکھوں ہی سے لیتے ہیں سب کام بیاں مجھکو

اہرام مصری یعنی فراعنہ مصر کی چند قبریں بھی دنیا کے سات عجائبات میں شمار کی جاتی ہیں یوں تو قاہرہ کے اردگرد بکثرت اہرام کے کھنڈر پائے جاتے ہیں مگر شہر سے تقریباً ۱۱ میل کے فاصلہ پر سب سے بڑے تین اہرام سے پانچ چھ ہزار سال پیشتر کے مصریوں کی صنعت دکاریگری کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تینوں خیمہ کی شکل کی عمارات وزنی پتھروں سے تعمیر شدہ ہیں۔ اُنکے نیچے کے حصوں میں بعض پتھر ایک خاصے بڑے کمرے کی دیوار کے طول و عرض کے برابر ہیں اور اُن کی چوٹیوں پر بھی بکثرت ۲½ ٹن کے وزنی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ سب سے چھوٹے مینار کا رقبہ لاہور کی مسجد وزیر خاں کے لگ بھگ ہوگا اور بلندی مسجد وزیر خاں کے مینار سے تقریباً دوگنی ہوگی۔ سب سے بڑے مینار کا رقبہ اور بلندی سب سے چھوٹے مینار سے تقریباً ڈیوڑھی ہے، موجودہ جرِ ثقیل سے اس قدر وزنی پتھروں کو اتنی بلندی پر لیجانا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ اہرام کی تعمیر کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انکے نزدیک اونچا پہاڑ ہوگا جس کی چوٹی پر پتھر تراش کر ایک دوسرے پر رکھے گئے ہونگے۔ کئی کہتے ہیں کہ دریائے نیل کا رُخ انکی طرف بدل کر کشتیوں کے ذریعے دور مقامات سے پتھر لاکر کسی طریقہ سے اُوپر نیچے رکھے گئے ہونگے۔ غرضکہ انکی تعمیر کے متعلق مختلف روایات سُنی جاتی ہیں مگر میری دانست میں دو ہی طریقے نظر آتے ہیں۔ اول یہ کہ شاید کارک کے بڑے بڑے تختوں کو اوپر نیچے رکھکر اہرام بنائے گئے ہوں۔ جو ہزارہا سال کی گردش کے بعد پتھر بنگئے ہونگے۔ دوئم یہ کہ شائد خدا نے آسمان پر تعمیر کر کے انہیں زمین پر رکھدیا ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ ابتدا ہی میں اُنکی تعمیر پتھر سے ہوئی تو یہ موجودہ تہذیب کی سخت توہین ہے کیونکہ اہرام کی بیرونی ساخت اور اُنکی اندرونی اشیاء کی حکمت و کاریگری کو مدِ نظر رکھکر ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ خود کو مہذب کہنے والا یورپ آج سے چھ ہزار برس پیشتر کے مصریوں کے مقابلہ میں طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا مثلاً اگر آج اہرام سے حاصل شدہ اشیاء کو دوبارہ وہیں رکھکر پہلے کی طرح دروازے پتھروں سے بند

کر دئے جائیں اور تمام عالم پر آئندہ تین ہزار سال تک تاریکی چھا جائے تو اس مدت کے بعد ہوائی جہاز۔ ریل۔ موٹر۔ بجلی۔ اسلحہ۔ لباس۔ عمارات وغیرہ کسی چیز کا نام ونشان باقی نہ رہیگا۔ مگر مصری اہرام میں نو ہزار برس کے انسانوں کی لاشیں۔ خورد ونوش کی مسالہ سے محفوظ کی ہوئی اشیاء اور اسائیشی سامان وغیرہ اب تک بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً ہرن۔ خنزیر۔ گائے۔ بکری وغیرہ کے جانوروں کے گوشت کے پکے لوتھڑے مرغی کے انڈے دجو دیکھنے میں بالکل تازہ نظر آئینگے) گیہوں۔ چاول اور دیگر اجناس۔ سادہ خمیری اور گوشت کے قیمے سے بھری ہوئی روٹیاں۔ بکثرت جانور جن کے بال و پر بالکل سلامت ہیں زیور۔ کپڑے۔ اسلحہ۔ گاڑیاں رتھیں۔ پلنگ وغیرہ غرضکہ ضروریات زندگی کی تمام اشیاء دیکھ کر انسان یہی نتیجہ نکالیگا کہ اُن چیزوں کو محفوظ رکھنے والے لوگوں کا زمانہ صنعت وحرفت میں بے نظیر تھا۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ اُس زمانہ کے لوگ بھی ہمارے ہی قدو قامت کے تھے، کیونکہ برآمدہ شدہ لاشیں عام انسانوں کی طرح ہی ہیں۔

چھوٹے مینار میں بکثرت گرنیائٹ پتھر (جو بہت وزنی اور عام پتھر سے خوبصورت ہوتا ہے) لگا ہُوا ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے پیشتر کسی مصری بادشاہ نے اپنے مقبرہ کے لئے چھوٹے مینار سے بکثرت گرینائٹ اُکھڑوا لیا تھا مگر بوجہ وزنی ہونے کے وہ اُن پتھروں کو دوسری جگہ لیجانے میں ناکام رہا۔ چنانچہ وہ پتھر ابھی تک مینار کے ارد گرد پڑے ہُوئے ہیں۔

اہرام کی اندرونی اشیاء۔ اہرام کے اندر پتھروں کی وزنی قبروں میں لاشیں تابوت سمیت رکھکر وزنی پتھروں سے ڈھک دی جاتی تھیں۔ یہ اہرام بیسیوں قبروں (جو ممکن ہے کہ مختلف شاہی خاندانوں کی ہوں) زر و جواہر و دیگر اشیاء سے پُر تھے۔ مُسلمانوں کے عہد میں ایک بادشاہ کو شبہ ہُوا کہ اہرام دولت سے پُر ہیں۔ اُن میں داخل ہونے کے لئے مُسلمان مدت تک دروازے کی تلاش میں ناکام رہے آخر ایک سال کی محنت کے بعد وہ ایک چھوٹا سا سوراخ کرنے میں کامیاب ہوگئے مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ سُوراخ کی دوسری جانب ہڈیوں کا ڈھیر نظر آیا اس لئے اندر داخل ہوئے بغیر بادشاہِ وقت نے سُوراخ کو اس خیال سے بند کرادیا کہ اہرام ہڈیوں ہی سے پُر ہیں۔ یورپین لوگ بھی بلا کے پتلے ہیں اُنھوں نے اہرام کے گاڑھے پلستر کی تہوں کو اُتروا کر (درمیانی مینار کے اوپر کے حصہ پر ابھی تک پلستر باقی ہے) محنت و جانفشانی سے دروازوں کا پتہ بھی لگا لیا۔ سچ ہے۔

مُزد آں گرفت جانِ برادر کہ خوار گشت

کہتے ہیں کہ اہرام میں سے علاوہ دیگر اشیاء کے بکثرت زر و جواہرات دستیاب ہوئے جن میں سے چند ابھی تک قاہرہ کے عجائب خانہ میں بھی موجود ہیں ٭

ابوالہول کا بُت۔ اہرام کے نزدیک ہی چھ ہزار سال کا بنا ہُوا دنیا کا سب سے بڑا بُت ابوالہول ہے اس کا تمام پتھر یلا جسم شیر کی طرح ہے صرف چہرہ انسان کی مانند ہے۔ کاریگروں نے چہرے پر روغن بھی اس حکمت سے کیا تھا کہ بالکل انسانی رنگت معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں کے نہ ہونے سے (جو قیمتی اور چمکیلی ہونے کی وجہ سے ہزار ہا سال پہلے نکال لی گئیں) اور ناک کے شکستہ کئے جانے سے چہرہ بدنما نظر آتا ہے۔ سنتے ہیں کہ مصر فتح کرنیکے بعد نپولین نے مسلمان ہو کر ثواب حاصل کرنیکے لئے اُس بُت کی ناک توڑ دی تھی۔ افسوس کہ آج مصریوں نے مرحوم محمد علی پاشا وغیرہ کے بُت بنا کر بازاروں میں نصب کئے سچ ہے دلی کے گھر شیطان اور شیطان کے گھر ولی پیدا ہوتا ہے اس بت کی لمبائی اور بلندی کا اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ اُسکے ایک کان پر دو آدمی آسانی سے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ بُت کے ارد گرد قریباً ۱۲ گز کے دائرے میں خاصی گہرائی تک زمین کُھدی ہُوئی ہے۔ بعض مصریوں کی زبانی سُنا گیا کہ ماہرین فرنگ نے اُس جگہ سے بھی بکثرت دولت حاصل کی تھی ٭

عجائب گھر کی لاشیں۔ طوالت کے خوف سے قاہرہ کے عجائب گھر کی ہزار ہا برس کی محوِ حیرت کرنیوالی اشیاء کو نظر انداز کر کے ذیل میں صرف لاشوں کے متعلق مختصراً عرض کرتا ہوں ٭ متکبر اور فرعون دماغ انسان کے درسِ عبرت کے لئے کمرے میں داخل ہوتے ہی بیسیوں ایسے فراعنہ مصر و رُوسا وغیرہ کی لاشیں نمائشی الماریوں (Show Cases) میں نظر آئینگی جو کسی زمانہ میں دولت و سلطنت کے گھمنڈ میں کسی کو اپنا ثانی نہ سمجھتے تھے مگر آج اُنکا کوئی نام لیوا نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ صرف اُمرا وغیرہ کی لاشیں ہی ممی کیجاتی تھیں۔ عوام اس کے بغیر ہی دفن کر دئے جاتے تھے۔ خدا جانے ممی کرنے میں کونسی ادویات استعمال ہوتی ہونگی۔ لاش کو چند یوم تک ادویات میں ڈبو کر بعد میں ½۱ و ۲ انچ چوڑی کپڑے کی پٹی تمام جسم پر بعینہ اس طرح لپیٹتے تھے جیسے کہ ہندوستان میں حقہ پر چند لپیٹی جاتی ہیں (ممکن ہے کہ وہ پٹی ادویات سے تر کر کے جسم پر لپیٹتے ہونگے) اُس پر چُست کفن سیا جاتا تھا۔ بعد ازاں لاش کو لکڑی کے تابوت میں (جس پر مُردہ کی رنگین تصویر بنائی جاتی تھی) ڈالدیتے تھے اور اُسے پتھر کی قبر میں رکھکر اس پر وزنی پتھر کا ڈھکنا دیدیا جاتا تھا۔ قبر کے ارد گرد ممی شدہ خورد و نوش کی اشیاء زر و جواہر بُت وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ اہرام کے علاوہ ارد گرد کے

میدانوں اور نیز مصر کے دیگر حصص میں سے بھی ایسی بکثرت قبریں مع سامان وغیرہ کے کھودی گئی ہیں +

پُرانے مصریوں کا مذہب - اگر غور سے دیکھا جائے تو اس زمانہ کے مصریوں کی طرز زندگی اور مذہبی عقائد وغیرہ بالکل ہندوانہ تھے۔ یا جس طرح کہ میں پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں کہ اُس وقت انسان ترقی کے راستہ پر چلتا ہوُا نقطہ "مج" تک پہنچا تھا کیونکہ گائے شیر۔ سانپ وغیرہ کے بُتوں و نیز بیسیوں دیوتاؤں کے مجسموں وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پُرانے زمانے کے مصری بھی ہندوؤں کی طرح اُن چیزوں کی پرستش کرتے تھے جن سے انہیں فائدہ نقصان یا خطرہ وغیرہ نظر آتا تھا۔ دریائے گنگا کی طرح وہ لوگ بھی نیل کی پرستش کرتے تھے اور ہندوؤں کی طرح اُن میں بھی غالباً بہادروں کی پرستش ہوتی ہوگی کیونکہ اُن سب چیزوں کے بُت مصر میں بھی موجود ہیں اور ایسی تصاویر بھی ہیں جن سے اُنکی طرز زندگی کا پتہ چل سکے +

توتنخ امین کی قبر - ۱۹۲۳ء کے شروع میں لارڈ کارنارن اور مسٹر کارٹر انجنیر (مشہور ماہران مصریات) نے شہر قاہرہ سے قریباً تین ساڑھے تین صد میل کے فاصلے پر لکسر کے ٹیلوں میں توتنخ امین کی قبر دریافت کی۔ میری موجودگیٔ مصر کے دنوں میں قبر کے بیرونی کمرے ہی کھولے گئے تھے۔ بعض مصری اُسے قارون کی قبر کہتے ہیں کیونکہ پچھلے سال بیرونی کمروں کی دولت ہی سے (جس کا اندازہ ۲۱ ملیون پونڈ لگایا گیا تھا) ماہرین فرنگ نے تسلیم کر لیا تھا کہ آجتک اس قدر قیمتی دفینہ دنیا میں کبھی دستیاب نہیں ہوُا۔ اُنہی کمروں میں زر و جواہر کے علاوہ بکثرت بت۔ سامان خورد و نوش۔ آسائشی اشیا اور برتن وغیرہ بھی برآمد ہوُئے تھے۔ لارڈ کارنافون کی اچانک موت (زہریلے مچھر کے کاٹنے سے وہ ایک ہفتہ کے اندر ہی قاہرہ میں مر گیا اُسکی موت کو آزاد مصری اپنے بزرگ توتنخ امین کی بد دعا سے تعبیر کرنے لگے) اور دیگر وجوہ کے سبب پچھلے سال قبر کا اندرونی دروازہ کھولنے کا کام آئندہ سال کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ سال رواں کے شروع میں ہندوستانی اخبارات کے ذریعہ سے اتنا معلوم ہو سکا کہ بیرونی کمروں سے بدرجہا زیادہ قیمتی اشیاء اندرونی کمروں یعنی توتنخ امین کی قبر کے اردگرد سے دستیاب ہوئیں اور کچھ عرصہ بعد یہ بھی پڑھا تھا کہ سعد زاغلول پاشا کی گورنمنٹ نے اُس قبر کو جبراً مقفل کر دیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ پچھلے سال کے شروع میں قبر دریافت ہونے پر فوجی گورے مصری وزرا کو بھی قبر سے ایک میل کے فاصلے تک نہ آنے دیتے تھے۔ بعد میں ہزار ہا یورپین و امریکن سیاحوں کی جد و جہد کی طفیل عوام کو بھی قبر دیکھنے کی اجازت مل گئی لطف یہ ہے کہ قبر کے بیرونی کمروں کے سامان وغیرہ کا جہاز غالباً جبرالٹر سے گذر چکا ہوگا کہ مصری پارلیمنٹ

میں قبر کی قیمتی اشیا کو ضبط کرنے کے متعلق دھواں دھار بحثیں شروع ہوئیں۔ مگر واہ رے سعد زاغلول پاشا آزاد ہو کر ایک ہی سال میں مصر کی کایا پلٹ دی اور توتنخ امین کی ہڈیوں پر قفل لگانے سے آپنے دنیا پر روشن کر دیا کہ مصری قوم شاہراہِ ترقی پر گام فرسا ہو رہی ہے۔ مزا تو جب تھا کہ اندرونی کمرے کے آگے سے پتھر ہی نہ ہٹانے دیا ہوتا یا شاید لوہار نے قفل تیار نہ کیا ہوگا کہ مسٹر کارٹر پتھر ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس قبر کے بیرونی کمروں میں جو بُت پائے گئے اُن میں سے دو دیوتاؤں کی مورتیاں قابلِ دید تھیں ایک بُت کے روبرو توتنخ امین کا مجسمہ اس طرح بنا ہوا تھا کہ وہ دست بستہ جھک کر اُسکی پوجا کر رہا ہے۔ دوسرا بُت عام دیوتاؤں کی مانند تھا قاہرہ کے عجائب گھر میں ان دونوں مورتیوں کے ممی شدہ اصلی جسم مع رنگین تصویردار تابوتوں کے نمائشی الماریوں میں موجود ہیں۔ کمال یہ ہے کہ اصل جسموں۔ بُتوں اور رنگین تصاویر میں کوئی فرق نظر نہ آئیگا اور تعجب ہے جو حروف اُن تابوتوں پر بنے ہوئے ہیں وہی اُن بُتوں پر بھی کندہ ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چھ ہزار سال کا انسان تین ہزار سال کے بعد (تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ آلِ فرعون کے بادشاہ توتنخ امین کی قبر آج سے تین ہزار تین سو برس پیشتر کی تعمیر شدہ ہے) کس طرح دیوتا بن گیا؟ ظاہر ہے کہ تصویر کشی کے رواج سے اُنکی تصاویر نسلاً بعد نسلٍ اُنکے خاندان میں محفوظ رہیں۔ حتیٰ کہ تین ہزار برس کے بعد وہی دیوتا تصور کئے جانے لگے ۔

متذکرہ بالا تحریر کے لکھنے کا مدعا یہ تھا کہ اگر دنیا کی صنعت و حرفت وغیرہ کو تہذیب تصور کر لیا جائے تو آج سے چھ ہزار سال پیشتر کے مصری موجودہ زمانہ سے زیادہ مہذب تھے ۔

مبارک علی سیالکوٹی

دوشیزۂ فرانس

۹

موت کے بعد

انسان کی قدر اُسکی موت کے بعد ہوتی ہے! لیکن دوشیزۂ فرانس کو مرے کئی سو برس گذر گئے اور دُنیا نے اس کی قدر نہ جانی!!

ژاں دارک کی موت کے بعد بلکہ اُسکے جلنے کے وقت ہی رُواں کے شہر میں رنج و غم کی اک لہر ضرور دوڑ گئی اور بعض شخصوں کو ندامت بھی ہُوئی لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ اثر جاتا رہا اور اُسکی حقیقی قدر کسی نے نہ جانی!

کون تھا جس کا سخت دل اک دوشیزہ کو جلتا دیکھ کر پگھل نہ گیا ہو اور وہ غم کے دو چار آنسو نہ رو دیا ہو انسان باوجود اپنی حیوانیت کے اپنی فطرت کی رفعت کو دبا نہیں سکتا وہ جذبے جن کی زنجیریں ہماری رُوح کو ربّانیت سے وابستہ کرتی ہیں ناممکن ہے کہ ظاہر ہو کر ہمیں تسخیر نہ کریں!

وہ شخص جو ژاں کے جلانے پر مامور تھا اگرچہ فی الحقیقت بیگناہ تھا اُسکی موت کے جلد بعد بھائی اسام بار سے ملا اور اس نے اپنے کرب و اندوہِ ندامت کا اظہار کر کے کہا مجھے ڈر ہے کہ اس قصور کی معافی مجھے کبھی نہ مل سکیگی+ ایک انگریز جس نے قسم کھائی تھی کہ وہ جلتی آگ میں اک گٹھا ڈالیگا جب ایسا کرنے پر آمادہ ہُوا۔ تو خدا جانے اُسے کس قوت نے آدبایا کہ کلیجہ پکڑ کر رہ گیا اور اُسکے ساتھی اُسے قریب کے ایک قہوہ خانے میں لے گئے اور اُس نے کہا کہ میں نے جلتی ہُوئی دوشیزہ کے سر پر ایک سفید فاختہ منڈلاتی دیکھی+ اسام بار اور ماسیو کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک افسر سے سُنا کہ جب ژاں کے جل جانے کے بعد انگاروں کو ہٹایا گیا تو دوشیزہ کا سارا جسم جل کر راکھ ہو چکا تھا لیکن اُس کا دل بدستور موجود تھا۔ ونچسٹر کے حکم سے یہ سب کچھ دریائے سین میں گرا دیا گیا+ لوگوں میں اَور بہت سی کہانیاں کہی سُنی گئیں+ کسی نے کہا کہ جب دھوئیں سے اسکا جسم گھر گیا تو اُس نے پانی کے لئے چیخ پکار کی اور میکائیل فرشتے کو نعرہ مارا+ وہ برابر یسوع یسوع کہے گئی یہانتک کہ اُس نے جان دیدی+ رُواں کا ایک پادری لوگوں کے انبوہ میں کھڑا رو رہا تھا اور ہچکیاں لے لے کے کہہ رہا تھا

کہ کاش کہ میری روح بھی وہیں ہو جہاں اس وقت اس خاتون کی روح ہے! + ماں شوں مثل نویس جس نے مقدمے کے دوران میں ژان کے بیانات تحریر کئے تھے کہتا ہے کہ میں عمر بھر میں بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت بھی کبھی اتنا نہیں رویا جتنا ژان کی موت کے وقت اور اسکے پورے ایک ماہ بعد تک میرا جی ٹھکانے نہ لگا + اسکا بیان ہے کہ مقدمے کے دنوں کی جو تنخواہ اسے ملی اس میں سے اس نے کچھ صرف کر کے ایک مسیحی دعاؤں کی کتاب خریدی تا کہ وقتاً فوقتاً دوشیزہ کے حق میں خدا کے حضور دعا کرتا رہے + ژان تریبا جو فرانس میں انگریزی بادشاہ کا معتمد تھا چوک سے اپنے گھر کو یہ نعرہ مارتا ہوا گیا "ہم سب کا ستیاناس ہو گیا ہم نے ایک اولیا کو جلا دیا" + ایک پادری نے کہا "میں نہیں جانتا اس وقت کوئی آدمی بھی ایسا ہوگا جس کے آنسو نہ بہے ہوں"

ژان دارک کے مارنے اور جلانے میں کس کا قصور تھا فرانسیسی مورخ اکثر انگریزوں پر الزام دھرتے ہیں انگریز اکثر فرانسیسوں کی بے پروائی کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں + حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں مذہب کا بہت رعب تھا عقل و علم کا دائرہ واقفیت نہایت محدود تھا اور توہم پرستی اپنے زوروں پر تھی لیکن صرف اسی قسم کی توہم پرستی جس کی مذہب اجازت دے۔ اس لئے جہاں کہیں جادو کا نام سننے میں آجاتا مذہب والے برافروختہ اور عوام الناس مرعوب ہو جاتے تھے کہ یہ شیطان الرجیم کا کام ہے اور اس کا قلع قمع کرنا ہمارا دینی فرض ہے + جب ژان دارک نے آسمانی پیام رساں ہونیکا دعوٰے کیا اور فرانسیسوں سے فتح کا وعدہ کیا تو انہوں نے کچھ تامل کے بعد اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور جب وہ فتحمند ثابت ہوئی تو دل سے اسکے قائل بھی ہو گئے پھر جب وہ ناکام رہی تو ان کا اعتقاد کمزور پڑ گیا انگریز اپنے آپ کو اجیت سمجھ چکے تھے جب وہ شکست کھانے لگے تو اپنے تسلی دینے کو سمجھ بیٹھے کہ ہو نہ ہو یہ اک جادوگرنی ہے جو ہم سورماؤں تک کے بازو شل کر دیتی ہے۔ فرانسیسوں کی حمایت جاتی رہی انگریزوں کی دشمنی روز بروز بڑھتی گئی۔ وہ جان گئے کہ اس جادوگرنی کی گرفتاری ہماری نصرت و عزت کیلئے لازم ہے اور انہوں نے ارادہ کر لیا کہ جب اسے پکڑ لیں تو زمانے کے دستور کے مطابق اس کے جادو سے چھٹکارا پانے کے لئے اسے جلا ڈالیں + اگر وہ ژان کو جادوگرنی نہ سمجھتے تو یقینی ہے کہ اسکے ساتھ اتنا برا سلوک نہ کرتے۔ غالباً پھر بھی اسے زندہ نہ چھوڑتے لیکن شاید اس طرح غیظ و غضب اور حیوانیت سے اسکے ساتھ بدسلوکی نہ کرتے + البتہ باوجود انکے جاہلانہ اعتقادات کے ان پر الزام ضرور عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے انسانیت سے کام نہیں لیا + اسکا ثبوت وہ ندامت و

اعتراف بھی ہے جو اس بارے میں انگریزی قوم سے پچھلے سو برس میں ظاہر ہوا۔ اگرچہ یہ مہذب قوموں کی عام عادت میں داخل ہے کہ وہ اپنے دشمن کی عظمت کا مدتوں اُسکے مرے پیچھے اعتراف کیا کرتی ہیں جب ایسا اعتراف اُنکے لئے کسی طرح ضرررساں نہ ثابت ہو + لیکن فرانس اور اُسکے فرمانروا کا رویّہ کس قدر افسوسناک ہے جن پر ژاآن نے احسان کیا اور آزادی سی بے بہا نعمت اُنہیں دی اور پھر جب سے وہ گرفتار ہوئی اُنھوں نے اُسکے چھڑانے کو ذرا ہاتھ پاؤں نہ ہلائے! واقعہ یہ ہے کہ فرانس اُن دنوں ایک قومی حکومت نہ رکھتا تھا نہ وہاں اک قومی جمعیت یا قومی جذبہ تھا جس کے باعث اہلِ فرانس متفقہ طور پر یا الگ الگ بھی شدت کے ساتھ دوشیزہ کی مصیبت کو جی میں محسوس کرتے۔ فرانس مختلف علاقوں یا صوبوں کا اک مجموعہ تھا جس میں قومی روح نے ابھی اچھی طرح سرایت نہ کی تھی اور خصوصاً رُواآں یا پیرس میں یہ خیال کسی کو کم ہو گا کہ ہماری اک ہموطن پر اجنبی حملہ آور ظلم وستم ڈھا رہا ہے + سچ پوچھئے تو ژاآن دارک اک ایسی وطن پرست تھی جسے دو تین صدی بعد میں پیدا ہونا چاہیئے تھا کہ اسکے وطن میں اس کی پوری قدر و منزلت ہوتی لیکن خدا کو منظور تھا کہ وہ قومیت کے زمانے سے پیشتر اپنے ملک میں پیدا ہو اور قومیت کے جذبات کو اُکسانے اور بھڑکانے میں مدد دے۔ ایسی شخصیتیں قدر و احسانمندی کی بھوکی نہیں ہوتیں وہ محض قدرت کا حکم بجالاتی ہیں +

ژاآن کی موت کے دوسرے ہی روز رُواآں میں سرکاری طور پر ایک مجلس منعقد کیگئی جو سات ججوں پر مشتمل تھی۔ اس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ژاآن نے واقعی مرنے سے بعد اپنے گناہوں اور غلطیوں کو مانا جو سراسر جھوٹ ہے + یہ سچ ہے کہ مرنے سے چند ساعت پہلے تک اُسے اپنی رہائی کے متعلق غلط فہمی تھی لیکن مرنے کے وقت وہ سمجھ گئی اور اُس نے بلند آواز سے نعرہ بھی مارا کہ میری آوازیں سچی تھیں انھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا +

دوشیزہ کی زندگی اور موت فرانسیسی قوم میں اک نئی روح پھونک گئی۔ ژاآن کی شہادت کے چند برس بعد اُس کی پیشینگوئی کے مطابق فرانسیسی بادشاہ انگریزوں کو شکستیں دیتا ہوا پیرس میں داخل ہوا اور اُس کی موت کے بائیس ۲۲ سال بعد ۱۴۵۳ء میں اُسی سال جب تُرک قسطنطنیہ میں داخل ہوئے انگریز جن کے بادشاہوں نے فرانس کے تھوڑے بہت علاقے پر تقریباً چار صدیاں حکومت کی تھی آخر فرانس سے باہر نکالدیئے گئے +

اس واقعہ کے تین سال بعد شاہ فرانس کے حکم سے ژان دارک کا مقدمہ از سرِ نو عدالت میں پیش ہُوا اس کا مقصد فقط ژان کا بیگناہ ثابت کرنا نہ تھا بلکہ زیادہ تر مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ ژان جس کی مدد سے فرانس کا شہزادہ تاجپوش ہُوا جادوگرنی نہ تھی بلکہ خدا کی ایک سچی پیغامبر تھی۔ اس لئے شاہِ فرانس واقعی شاہی کا حقدار تھا + اسقفِ رُواں کے محل میں اُسی طرح جج بیٹھے ژان کی ماں اور بھائیوں کی طرف سے کوشوں صدرالصدور اور لمیتر نائب صدر کے وارثوں اور قائمقاموں کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا اُسی طرح گواہ طلب ہُوئے اور آخر میں بیچاری ژان مرحومہ کے حق میں بڑے زور شور سے فیصلہ سنایا گیا کہ وہ ایک نہایت صاف دل و نیک نیت دوشیزہ تھی + اس عجیب و غریب واقعہ میں اہل فرانس نے عام طور پر کوئی غیر معمولی دلچسپی نہ دکھائی جس کا سبب یا یہ ہوگا کہ اُس زمانے میں ایسی خبروں کا ادھر سے اُدھر پہنچنا ذرا مشکل تھا یا شاید یہ کہ فرانسیسی اپنی بے اعتنائی سے جو ژان کی گرفتاری کے بعد اُن سے ظاہر ہُوئی نادم تھے + کچھ بھی ہو یہ بات اس سے بھی بڑھ کر تعجب انگیز ہے کہ صدیوں تک ژان کی دُنیا بلکہ اُس کے اپنے وطن نے قدر نہ جانی اور اُسکی شہرت مدتوں گمنامی کے پردے میں چھپی رہی +

سولھویں صدی میں مشہور انگریزی شاعر شکسپیئر نے اپنے ڈرامہ ہنری ششم میں "دوشیزہ" پر خاک ڈالنے کی کوشش کی۔ حال میں تحقیقاً معلوم ہوا ہے کہ ڈرامہ کا یہ حصہ اس شاعر کے قلم کا لکھا ہُوا نہیں + اٹھارھویں صدی میں فرانس کے مشہور انقلابی مصنف والٹیئر نے ژان دارک کا نہایت بُرے لفظوں میں ذکر کیا اور اُسی زمانے میں جرمن مصنف شلر نے بھی اُس کا مضحکہ اُڑایا +

لیکن اُنیسویں صدی میں جو یورپ کے انقلابات کا زمانہ ہے صدیوں کے بھولے ہوئے یاد آئے اور دوشیزۂ فرانس کی بھی باری آئی + ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی مورخ میشلے نے اپنی تصنیف تاریخ فرانس میں ژان دارک کی ایسی تصویر کھینچی کہ فرانس کا دل ہمدردی کی کسک سے کانپ اُٹھا۔ وہ جسے چار سو سال تک اُس کے وطن نے آنکھ بھر کر نہ دیکھا تھا یکایک نور کا تاج پہنے نظر آئی + ۱۸۴۱ء میں کیشیرا نے اپنی اعلیٰ تصنیف میں ژان کے مقدمے اور اُس کی بحالی کے مفصل حالات پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کئے، جس سے تاریخی دُنیا میں اُس کے متعلق اک نئی قسم کی گہری دلچسپی پیدا ہونے لگی اور امریکہ میں مارک ٹوئین نے ژان کی ایک دلچسپ سوانح عمری لکھی + حال میں مشہور فرانسیسی مصنف اناتول فرانس نے اس "ژان پرستی" کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی تصنیف "سیرت ژان دارک" میں دوشیزہ کی فوجی یا سیاسی قابلیت کو اک

نہایت عام بات کر دکھایا۔ اس پر اینڈریو لینگ نے انگلستان میں ژان کی جانبداری میں ایک زبردست تحریر پیش کی اور ثابت کیا کہ ژان فی الحقیقت ایک حیرت انگیز شخصیت تھی جس سے نہ صرف قرونِ وُسطیٰ متاثر ہو سکتی تھیں بلکہ دورِ جدید بھی اُس کے حالات کو سُن کر ششدر رہے۔

بیسویں صدی جسے عام طور پر ملحد اور مادہ پرست کہا جاتا ہے فی الحقیقت ان خطابات کی مستحق نہیں۔ سائنس پرستی کے اس دور میں اولیا پرستی بھی جاری ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ژان دارک کو باقاعدہ طور پر "محترمہ" کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۸ء میں اس کے نام کے ساتھ "برکت والی" لکھا گیا اور ۱۹۲۰ء میں کلیسا نے اُسے سرکاری طور پر "اولیا" مان لیا۔

پچھلے سالوں میں دوشیزۂ فرانس کے متعلق متعدد تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ دو سال ہُوئے۔ شہرۂ آفاق انگریزی مصنف و ڈراما نویس برنارڈ شا نے ایک ڈرامہ جون اولیا لکھا جو پہلے نیویارک میں گیرک تھیئٹر میں پیش کیا گیا اور پھر پچھلے سال لندن کے نیو تھیئٹر میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ دکھایا گیا۔ (راقم نے خود لندن میں اسے دیکھا ہے)۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ ژان دارک جو ۱۴۳۱ء میں خدا کے حکم سے خدا کی راہ میں شہید ہوئی دُنیا نے تقریباً پانچ صدیوں کے بعد اُس کا جوہر پہچانا اور وہ جسے جہالت کے زمانے میں جادوگرنی کہکر جلا دیا گیا آج طبیعیات و مادہ پرستی کے وقت میں اُسے اولیا کہا گیا اور اُس کی نفسی و روحانی قوتوں کے آگے ہر کہ ومہ نے سرِ تسلیم خم کیا۔

ژان دارک! تو غمگین نہ ہو گو دُنیا نے کبھی تجھے بھڑکتی ہُوئی آگ میں جلنے کو چھوڑ دیا تھا آج صدیوں بعد وہ خود تیری آتشِ محبت میں جل رہی ہے اور جس طرح تُو نے جل کر خدائے عزّ و جل کے پہلو میں جگہ پائی۔ اسی طرح ہم بھی تیری محبت کے شعلوں میں جو ہمارے جی سے لپٹ چکے ہیں پروردگارِ عالم کے نور کا عکس دیکھ رہے ہیں!

اے جل مرنے والی! تو ہمیشہ زندہ رہیگی!

بشیر احمد

جذباتِ آزاد

ذیل میں آزاد مرحوم کی اُن تحریروں کا اقتباس درج ہے جو انہوں نے اس زمانہ میں سپردِ قلم کیں جب اُن کی دماغی کیفیت میں کچھ تغیر آگیا تھا لیکن اہلِ نظر کو ان پریشاں خیالات میں بھی مرحوم کے غیر معمولی جوہرِ فضل و کمال کی جھلک نظر آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ (ایڈیٹر)

ہم ہیں غضب میں اور یہ ہیں ہمارے غضب میں، ہمارا غضب اُن پر ایسا ہے کہ انہیں خبر نہیں یہ ہنستے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ کیا ہُوا اور اب کیا ہو جائیگا۔ یہ دیکھ رہے ہیں کتابیں، اور سوچ رہے ہیں کہ کس طرح اس شدنی کو روک لیں یہ ہے غضب ہمارا ——— ہم ہیں اور ہم آپ ہیں، اور جو کچھ ہے وہ فعل ہے فاعل کا۔ فعل بغیر فاعل کے نہیں ہوتا وہ فاعل کا محتاج ہے اسی واسطے فاعل فعل پر مقدم ہونا چاہیئے، اور ہم سب پر۔ جب یہ ہے تو ہمکو سب پر مقدم ہونا چاہیئے اور دیکھو ہم ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ہم ہیں، پھر کیا سبب ہے کہ یہ ہمکو نہیں مانتے بس یہی انہیں کیونکر یقین آئے کہ ہم ہیں اور ایسے ہیں، جب غضب آئیگا تو آپ ہی جان لینگے ——— اکیا ہم تم سے کچھ مخفی ہیں؟ نہیں مخفی تو نہیں، پھر کیا سبب ہے کہ تم ہمکو بھولے ہوئے ہو یہ خلاف تو نہیں اسے تو بیخبری کہنا چاہیئے، مگر تم بیخبر بھی نہیں۔ پھر کیا سمجھیں ہم؟ اور اس صورت میں جو گناہ کرتے ہو تم اسکی سزا کیا دیں؟ ہم جو سزا دیتے ہیں، تمہاری خاطر میں نہیں آتی اب جو سزا دینگے وہ دیکھو گے تم ہاں ہمنے کہدیا ہے اور لکھوا دیا ہے اور ایکدفعہ نہیں بار بار لکھوا دیا ہے، اور سینکڑوں باتوں کو ایسا ظہور دیا ہے کہ تم خوب سمجھ گئے ہو! اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کا فلسفہ جب ہم پورا کرینگے، تم گھبرا اُٹھوگے! ہم ہیں کہ تجھ میں ہو کر بولتے ہیں، تو ہم میں ہے، اسلئے جو ہم میں ہے تجھ میں ہوتا ہے تو ہے حجاب ہم پر جبکہ تو کرتا ہے کام عالم ناسوت میں ہمارے حکم پر، ہم نہیں ہوتے تجھ میں جبکہ تو ہوتا ہے غیر۔ غیر کیا؟ غیر یہ کہ ہم اور، تو کچھ اور، بس یہ ہے حجاب ہم ہر کام کو اسکے وقت پر کرتے ہیں، اور ہوتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ وہی جب ہم اسوقت کو طول دیں، تم کہوگے دیر ہوئی، وہ دیر نہیں ہماری مصلحت ہے۔ ہم اپنے حکم کے مالک ہیں، جب چاہتے ہیں کرتے ہیں تم ہو بندگی میں۔ جب ہم تمکو دیتے ہیں تو تم لیتے ہو اور نہ دیں تو خود بھی کچھ نہ کچھ کہتے ہو! وہ ہمارا نہیں تمہارا ہوتا ہے مگر وہ ہماری دی ہوئی عقل سے ہوتا ہے افلاطون الٰہی نے ہمسے پایا اور سب کو دیا وہ ہمارا اشراق ہے اس میں یقین چاہیئے وہی ایمان ہے وہ جوہر ہو اور صلاحیت رکھتا ہو تو اُس پر وارد ہوتا ہے صلاحیت ہوتی ہے، ریاضت اور تقدس سے ان میں سے ایک نہ ہو تو اشراق نہ ہوگا۔ اسکے لئے طول مدت بھی ہے بمقتضائے مدت، جوہر میں روشنی ہوتی ہے اور جوہر بھی بمقتضائے خود مانگتے ہیں طول مدت یہ ہیں معتقدات علم اشراق کے

وظیفۂ عشق

(ورڈز ورتھ)

سیکھنا ایک جذبۂ فانی سے راہِ ارتقا
عشق کی اغراض میں مضمر تھا یہ سرِ بقا
عشق کی تخلیق، اس کی پرورش، نشو و نما
بہر تردیدِ انانیت تھی منظورِ خدا
بندگیٔ نفس گویا خواب کی زنجیر تھی
فوتِ مقصودِ محبت اس کی اک تعبیر تھی
تارِ اشکِ چشمِ نم لیکن ہے باجِ دردِ دل
خارِ خشکِ حسرت و ارماں خراجِ دردِ دل
شیوۂ انساں ہے رنج و گریہ و آہ و بکا
کلبۂ احزاں ہے قلبِ عاشقِ دردِ آشنا

(ادارہ ذاکرحسین بلالی)

آرزو

اک طلسمِ بے حقیقت تھا جہانِ آرزو
آرزو وہ ہو کہ پیدا جس سے ہو راہِ عمل
کوہ و صحرا خود پتہ دیں منزلِ مقصود کا
کیا سبب کیوں دلِ شکستہ طور سے لوٹے کلیم
ہے زباں عاجز بہت مشکل ہے عرضِ مدعا
وہ قبولِ التجا کا وقت ہے، جب سوئے عرش
لب پہ آ کر آرزو برباد ہو جاتی نہ کیوں
کُو دعا دل سے کہ بلجائے دلِ بے مدعا

آج ہم پر کھل گیا سود و زیانِ آرزو
ہے فریبِ زندگی ورنہ جہانِ آرزو
عشق اگر بن جائے میرِ کاروانِ آرزو
کچھ نہ کچھ الجھا ہوا ہوگا بیانِ آرزو
کاش بن جائیں نگاہیں ترجمانِ آرزو
ہوں نگاہیں۔ بند ہو جائے زبانِ آرزو
شاخِ عریاں پر بنا تھا آشیانِ آرزو
تا بکے خورشید مشقِ امتحانِ آرزو

میر خورشید احمد خورشید۔ کشمیر

خیالاتِ ہمایوں

اُردو شاعری

انسانی تحریکات کا ایک اور شعبہ جس میں ہم مُسلمان فقدانِ تربیتِ نفس کی وجہ سے نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ ہمارا علم ادب ہے اور اس سلسلہ میں میں آپ کی توجہ عاشقانہ شاعری کے ایک شعبہ کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ پُرانے طرز کے مُسلمان اُردو شاعر کا معشوقِ خیالی جو انسانی حسن کا اعلیٰ معیار سمجھا جاتا ہے ایک فوق العادت کرشمۂ قدرت ہے۔ جس کا دہن جہندس کے نقطہ سے بھی چھوٹا اور جس کی کمر بال سے بھی زیادہ باریک۔ نقطہ کے ساتھ دہن کی تشبیہ کی مثال کیلئے تو میں اُس فارسی شاعر کا ایک شعر پیش کرتا ہوں جس کے طرز بیان اور مذاق کی تقلید کی کوشش ہمارے اُردو شعرا نے کی ہے۔

اے ناقصِ کلام حکیماں بیانِ تو — کردی بہ نطق نقطۂ موہوم را دو نیم

اور کمر کی تشبیہ کی مثال میں میں ایک اُردو شاعر کے ایک مشہور شعر کا حوالہ دیتا ہوں۔

صنم کہتے ہیں تیرے بھی کمر ہے — کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

اگر آپ حضرات ایک لمحہ کے لئے غور کریں تو آپکو معلوم ہو جائیگا کہ قلمروِ ادب میں اس قسم کی شاعری جو شاعر کے انتہائی مبالغہ کے شوق کو ظاہر کرتی ہے قوتِ شاعری میں تربیت ضبط کے فقدان پر دال ہے اور جب آپ یہ بھی یاد فرمائینگے کہ علم بلاغت کے جید مصنفین صنعت مبالغہ کو ان استعارات میں بلند مرتبہ دیتے ہیں جن سے ہماری شاعری میں خوبی اور قوت پیدا ہوتی ہے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ضبط و تربیت کا فقدان نہ صرف ہماری روزمرہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ تخیل کے ان قدرتی سرچشموں میں بھی پایا جاتا ہے جو ہماری ذہنی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

ہیجانِ جذبات۔ شاعری کی نسبت ذکر کرتے ہوئے میں اس امر کے بھی اظہار سے باز نہیں رہ سکتا۔ جو میری رائے میں ہماری تعلیمی مجالس کا بڑا نقص ہے اور جس سے یہ کانفرنس بھی مبرا نہیں ہے۔ ہمارے سالانہ جلسوں میں یہ عام رواج ہے کہ سامعین کے جذبات کو جوش میں لانے مُسلمانوں کی موجودہ نسلوں کو انکی اس ذلت کا جس میں وہ بمقابلہ اپنے نام آور بزرگوں کے گر گئے ہیں۔ حال سُنانے اور اس طرح انکی عملی

ہمدردی کو قومی ترقی کی حمایت میں وابستہ کرنیکی غرض سے نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ اس مقصد سے ارفع کوئی مقصد نہیں اور جس نیت سے کہ ہمارے نوجوان شعرا یہ نظمیں تیار کرتے ہیں وہ ہر طرح سے قابل ستائش ہے۔ لیکن ہمارے کام کے طریقوں پر اور قوم کے مذاق پر اس کا جو عملی اثر ہوتا ہے اسکو ملاحظہ کیجئے۔ مشرقی اقوام میں تعصبات کو متواتر تحریک دینے کے اثر سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کم و بیش عارضی ہوتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت سامعین پر ایک تخیلی حالت طاری ہوجاتی ہے جو بار بار پیدا ہونیکی وجہ سے طبیعت ثانی بن جاتی ہے اور کسی عملی کارگذاری کے اجرا کی قوت جس میں جذبات کو دخل نہ ہو بہت کمزور ہو جاتی ہے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ماسوائے ان خاص موقع کے جب خطرہ کا احساس یا موقعہ کی اہمیت مسلمانوں کو کسی کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ عام طور پر مسلمانان ہندوستان اپنی عملی کارروائی کو دلگداز اپیلوں تک محدود رکھتے ہیں اور بحالت سکون ان اپیلوں کے عملی نتائج پر غور نہیں کرتے۔ اس قوم کو جس کے مزاج نے ایسی ترکیب پائی ہو دیگر اقوام سے جنکی طبیعت میں جذبات کو نسبتاً کم دخل ہے بہت کچھ سیکھنا ہے اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ اس دارالعمل میں ان اقوام سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کریں تو ان کو بہت کچھ بھلانا بھی پڑیگا۔ ایک بڑی ضرورت آپکو یہ بات سیکھنے کی ہے کہ اپنے تعلیمی اور دیگر ہر قسم کے کام کو کاروباری اصول کے مطابق سکونِ دل و دماغ کے ساتھ آتش تخیل کی اس مضطربانہ شعلہ فشانی کے بغیر سرانجام دیں، جن کا نتیجہ صرف دھواں ہے اگر بعض مقامات میں قوم کی خاص ضروریات آپکو اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ اپنے کام کے پروگرام میں کچھ دلچسپی پیدا کریں تو کبھی کبھی شاعری کی چاشنی دینا بیجا نہ ہوگا مگر اس چاشنی کا استعمال حدود استعمال سے متجاوز نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر آپکو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ شاعری براہ راست مفید مطلب ہو اور وہ وقت اور وہ توجہ اس پر ضائع نہ کیجائے جو کسی زیادہ مستحسن مشغلہ میں صرف ہو سکتی ہے تعلیمی تحریکات کو بھی جیسا کہ مغربی اقوام کا طریق عمل ہے کاروباری اصول پر چلانا چاہیئے اور جذبات کو بالکل پس پشت ڈالدینا چاہیئے تعلیمی ضروریات کا بلحاظ موقعہ و محل مطالعہ کرنا چاہیئے۔ واقعات کو جانفشانی سے جمع کرنا چاہیئے اور ٹھنڈے دل کے ساتھ ان سے نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ ملک کی دیگر اقوام کے طرز عمل پر نظر رکھیئے اور انکی خوبیاں قبول کر لیجئے اور عیوب ترک کر دیجئے۔ غیر ترقی یافتہ مقامات میں اپنے ہمقوم اصحاب کو آمادہ کیجئے کہ ان سہولتوں سے جو سرکار دولتمدار نے انکی ترقی تعلیم کیلئے مہیا کی ہیں۔ پورا فائدہ اُٹھائیں اور اس معاملہ میں حسب ضرورت قوم کی طرف سے سرکار کا ہاتھ بٹایا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ ضروری ہے

کہ تمام ہندوستان میں مقامی مجالس قائم کیجائیں جو ایک طرف تو مقامی مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہوں اور دوسری طرف ایک نمائندہ پراونشل مجلس کے ذریعہ سے اس مرکزی کانفرنس سے مربوط رہیں۔ اس طرح سے آپ قوم میں کام کرنیکے لئے ایک عملی روح پھونک دینگے اور تعلیمی ترقی میں ایک گرانقدر کامیابی حاصل کر سکینگے۔

ہمارا شعبۂ ادب - اگر آپ اس امر پر غور فرمائینگے کہ ہم زبان اردو کی کیا خدمت کر رہے ہیں اور اُسکے ساتھ ہمارا سلوک کس قسم کا رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہاں سے آپکو ہماری قوم میں عملی کوتاہی کا ثبوت ملیگا۔ اس زبان کی نشو و نما کیلئے عرصہ دراز سے اس کانفرنس کا ایک خاص سیکشن جسے لیٹریری سیکشن یا "انجمن ترقی اُردو" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے قائم ہے۔ اس سیکشن کا کام نہایت بیقاعدگی اور بے ضابطگی سے ہوتا رہا ہے اور اُردو کی فلاح و بہبود کیلئے جو کوشش گاہ گاہ اس کانفرنس کی طرف سے کیگئی ہے وہ ہماری سالانہ کارگذاریوں کا ایسا حصہ ہے جو سب سے کم مستحسن ہے اُردو جسکو عام طور پر "ہندوستانی" کہتے ہیں مسلمانان ہند کی بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصہ کی زبان ہے اور اُسکو ہندوستان میں وہی رتبہ حاصل ہے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہے، اس زبان کی ادبی اور علمی نشو و نما میں مدد پہنچانا ہماری کانفرنس کے پروگرام کا خاص اہم جزو ہے اس ذمہ داری کو انجام دینے میں ہماری قوم نے نہایت غفلت دکھائی ہے اور اگر ہماری تغافل شعاری کا یہی حال رہا اور مستعدی اور چستی سے ہم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو ہمکو ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا جو ان مشکلات سے زیادہ سخت ہونگی جو مسلمانان بہار اور صوبہ جات متحدہ کو پیش آچکی ہیں، ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اُردو کو ایسی سہولتیں حاصل ہیں کہ اگر اس کانفرنس کی طرف سے معمولی سی امداد بھی صحیح اصول اور باقاعدہ طریق پر کیجائیگی تو وہ تمام رکاوٹیں جو اس زبان کی ترقی میں سد راہ ہیں دُور ہو جائینگی کچھ عرصہ کیلئے اُردو شاعری کی طرف ہمکو اپنی توجہ کم کر دینی چاہئے اور ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ شعبہ شاعری میں تصنیفات کا سلسلہ کم کر دیا جائے اور اپنے نوجوانوں کو آمادہ کیا جائے کہ انگریزی زبان کی تصنیفات جو علمی مضامین پر جدید تحقیقات کے متعلق ہیں انکے تراجم زبان اُردو میں تیار کر کے اردو لٹریچر کو مالا مال کر دیں اس مدعا کے حصول کے واسطے یہ ضروری ہے کہ تمام علوم جدیدہ کی اصطلاحات کی ایک مکمل لغات تیار کیجائے یہ اصطلاحات ان مصطلحات کا جو زبان انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں عموماً مروج ہیں یا تو ترجمہ ہوں یا انکا انتخاذ ہوں اس کام کیلئے ماہران فن کی ایک مختصر سی کمیٹی قائم ہونی چاہیئے۔ یہ کمیٹی اس ذخیرہ سے جو لٹریری سیکشن کے بعض سربرآوردہ کارکنوں نے جمع کیا ہے اور کسی قدر ترتیب بھی دیدیا ہے فائدہ اُٹھا سکتی ہے اور اُن لائق نوجوانوں سے بھی مدد لے سکتی ہے جو حب وطن کے جذبہ میں اس کام کو شوق اور جانفشانی سے کرنیکو تیار ہوں، اس معاملہ میں ہمکو اپنے مستعد ہندو دوستوں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے انہی صوبجات میں اس قسم کی لغات جسکا میں ذکر کر رہا ہوں زبان ہندی میں مرتب کر لی ہے اور جنکی مستقل

اسلوبِ بیان

اسلوب بیان کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ بعض لوگ اسکو محض آرائش تصور کرتے ہیں۔ مدرسین اسکو بہت پسند کرتے ہیں معمولی آدمی کے نزدیک اسکی کچھ قدر ہی نہیں۔ مگر حقیقت میں انداز بیان ہر شخص کا خاص ہوتا ہے ہم جس طرح جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہی ہمارا انداز بیان ہے۔ اب سوال یہ ہے آیا یہ انداز بیان اچھا ہے یا بُرا۔ جب ہم کسی قصہ کو بیان کرتے ہیں تو ہمارا منشا یہ ہوتا ہے کہ اپنے سامعین کو کبھی خوش کریں یا کبھی اسکے خوفناک نتائج سے متنبہ کریں۔ اگر ہمارے الفاظ کا ان لوگوں پر مطلق اثر نہ ہو تو اسکی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ہمارے اسلوب بیان میں کوئی نقص ضرور ہے یعنی ترتیب کی خرابی پیچیدہ، مشکل عبارت یا لفاظی ۔

اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلوب بیان کی ضرورت صرف طرحی یا خزنی خیالات کے ظاہر کرنے کے وقت پڑتی ہے بلکہ اسلوب بیان جسم کا کام دیتا ہے جس میں خیالات کی روح بھری جاتی ہے۔ روح تو نہایت لطیف چیز ہے جسکا دیکھنا امکان سے باہر ہے۔ صرف جسم ہی ایسی چیز ہے جسکا ظہور ہوتا ہے۔ جسم اچھا ہوگا یا بُرا۔ اگر جسم اچھا اور خوشنما ہو تو اس کو دیکھکر ہر شخص خوش ہوگا۔ اور اگر جسم میں خرابی ہو تو کوئی شخص اس کی جانب التفات بھی نہیں کریگا۔ یہی حال اسلوب بیان کا ہے ۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے گہرے خیالات کو زبان کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں مگر جب اُس میں ایک دفعہ کامیاب نہیں ہوتے تو پہلے مسودہ کر لیتے ہیں، پھر اسکو اچھی شکل میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اسکے بعد بھی اُنکا مقصد حاصل نہیں ہوتا تو مجبور ہو کر اس سے برداشتہ خاطر ہو جاتے ہیں ۔

بیان کی پختگی کوئی آسان بات نہیں ہے کہ ہر شخص فردوسی، نظامی، سعدی، میر، غالب، اقبال، اور حالی بن جائے یا ان شاعروں یا انشا پردازوں کی ٹکر کی نظمیں لکھے لیکن ہم میں سے بہت سے تھوڑی ہی مشق کے بعد اچھے اور بُرے میں تمیز کرنیکے قابل بن سکتے ہیں کہ کونسے لفظ کی آواز اچھی ہے یا بُری؟ کونسے لفظ کو اپنے تناسب کے لحاظ سے کہاں جگہ دینی چاہیئے؟ اس طرح ہمارے دماغ میں ایک تناسب پیدا ہو جائیگا جسکے ذریعہ سے کسی نظم یا نثر کی خوبی یا بُرائی کو ہم جانچ سکینگے ۔

اسلوب بیان کے عناصر۔ اچھا اسلوب بیان وہی ہے جو اپنے موقع کے لحاظ سے ٹھیک ہو یعنی اگر ہمیں

مرثیہ لکھنا ہو تو مثنوی کی بحر نہ استعمال کرنی چاہیئے۔ کیونکہ بحروں میں خاص موسیقیت ہوتی ہے۔ جو اپنے اپنے محل پر لطف دے جاتی ہے، اگر انیس اور دبیر مراثی کی بحروں کو چھوڑ کر مثنوی کی بحریں اختیار کرتے تو انہیں اس قدر کامیابی نہ ہوتی۔ انیس کو اپنے خاص اسلوب میں مراثی لکھنے کی جو دستگاہ تھی نہ وہ غالب میں تھی نہ ذوق میں۔ ذوق میں قصیدہ لکھنے کا جو کمال تھا وہاں تک غالب کی رسائی نہیں ہوئی۔ غالب نے ایک دفعہ احباب کی شدید فرمائش سے مرثیہ لکھنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ اس نے اپنا ناتمام مرثیہ اپنے دوست کے پاس روانہ کر دیا۔ میر کو غزل گوئی میں جو کمال ہے وہاں تک نہ غالب کی رسائی ہوتی ہے اور نہ ذوق کی۔ بلکہ اس کا اسلوب بیان ان سے علیحدہ ہے۔ میر کا کیا اچھا شعر ہے ؎

بارے دُنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اس شعر میں "بارے" کا لفظ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس سے پہلے ایک واقعہ حذف کر دیا گیا ہے اور اسلوبِ بیان کا یہی کمال بلاغت کی جان ہے، اسی طرح میر کا ایک شعر ہے ؎

اب کی، جنوں میں، فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس کا اسلوب بیان لاجواب ہے کیونکہ باوجود مضمون مبتذل ہونیکے نہایت عُمدہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح غالب کا ایک شعر ہے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جامِ جم کی قیمت کو گھٹانے میں اسلوب بیان اور انتخاب الفاظ نے کیا جادوگری کی ہے۔

اس سے ہمارا ذہن انتخاب خیالات کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ انتخابِ خیال اسلوبِ بیان میں ایک نہایت اہم چیز ہے۔

اگر کوئی مصنف صرف کسی واقعہ کی اطلاع دینا چاہتا ہے تو اسکے لئے انتخاب کا زیادہ موقع نہیں ہے کیونکہ واقعات کا مواد تو موجود رہتا ہی ہے اسکا کام صرف بیان کر دینا ہے مگر جب اس کا ارادہ یہ ہو کہ اپنے خیالات کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع پر کبھی خوشی کبھی غم، کبھی امید کبھی یاس کا جذبہ طاری ہو تو اسکو

اس وقت یہ بات محسوس ہوگی کہ اپنے خیالات کو منتخب کرے۔ ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کے عام اصول بیان کرے یا اصول بیان کرنیکے بعد مثالیں بھی دیتا جائے۔ اگر کہیں تفصیل کی ضرورت ہو تو اس مقام کی تصویر کھینچ دے ایجاز کی ضرورت لاحق ہو تو ایسے مختصر الفاظ تجویز کرے جس میں بہت وسیع مطلب سما جائے اور پھر بھی سامع کے ذہن میں کوئی حالت منتظرہ اسکے سننے کے بعد باقی نہ رہے ❖

اگر عام اصول کے ساتھ غیر محسوس چیزیں بھی ہوشیاری اور دانائی سے شامل کیجائیں تو اس سے متانت اور سنجیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ اطناب کی حالت میں محسوس چیزوں کی زندہ تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ❖

شاعر یا انشا پرداز جب کسی واقعہ کو نظم کرتا ہے یا اس کو نثر میں بیان کرنا چاہتا ہے تو اسکے دل پر اس واقعہ کے بیان کرنے سے پہلے ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ وہ جس چیز کو جس طرح دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اگر اس کا اثر اسکی نظم و نثر میں بھی باقی رہے تو اس کا شمار زبان کے بہترین مصوروں میں ہوگا۔ کسی چیز کی تصویر کھینچنی اس لئے آسان ہے کہ ہم اسکو دیکھتے ہیں مصور کا کمال یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے ہو بہو تصویر کھینچی ہو مصور کے پاس تصویر کشی کے لئے مختلف قسم کے رنگ عمدہ کاغذ، اور اچھے اچھے موقلم ہوتے ہیں یا اچھا مصور ان چیزوں کو حاصل کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اگر مصور اچھا ہو اور رنگ وغیرہ میں خرابی رہ جائے تو اسکو اپنا کمال ظاہر کرنے میں دشواری ہوگی۔ جب مصور کے پاس یہ تمام ضروریات مہیا ہوجاتی ہیں تو اسکو یہ فکر ہوتی ہے کہ کونسی چیز ایسی ہوگی جسکو دیکھکر لوگ خوش ہونگے اس لئے اب اسے کسی بہتر سے بہتر چیز کی تلاش ہوتی ہے جسکی تصویر کشی سے اس کو اظہار کمال میں مدد ملے ❖

یوں تو ہر شخص کسی چیز کی تصویر کھینچ لیتا ہے مگر جن لوگوں کو کمال حاصل ہوتا ہے انکی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ شاعر یا انشا پرداز کے پاس واقعات کے اظہار کیلئے کافی مواد مہیا رہتا ہے اور یہ مختلف خیالات اور الفاظ کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کا کمال یہی ہے کہ موقع کے لحاظ سے بہتر سے بہتر الفاظ اور خیال کو منتخب کرے۔ اور اسکو اس انداز سے بیان کرے کہ پڑھنے والے متحیر ہوجائیں ❖

صنائع و بدائع۔ صنائع و بدائع بھی اسلوب بیان میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اردو ادب میں صنائع و بدائع کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جب ہم کسی زبان کی ابتدا کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل صنائع و بدائع کا استعمال خاص ضرورت سے خاص خاص مواقع پر ہوا تھا مگر زمانہ دراز کے بعد صنائع و بدائع

میں ایسی نزاکت پیدا ہوتی چلی گئی کہ اصل مقصد مفقود ہو گیا۔ اس لئے انہیں زبان کا زیور نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ جو شاعر یا انشاپرداز اپنے کلام کو بہت زیادہ زیور سے آراستہ کریگا کوشش کریگا۔ اسکا کلام تکلفات کی نذر ہو جائیگا۔

اُردو زبان میں تشبیہ، استعارہ، ایہام، تصاد، مراعات النظیر، مبالغہ وغیرہ بہت مستعمل ہیں۔ انگریزی زبان میں تشبیہ، استعارہ، تجرید، حسن ندا، تضاد وغیرہ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، مبالغہ مجاز مرسل وغیرہ کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے۔ عموماً مبالغہ کو جو غیر فطری صنعت ہے پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تشبیہ ایسی صنعت ہے جس کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اردو زبان کو تشبیہوں کا کثیر خزانہ عربی اور فارسی سے ملا۔ اس لئے اس کو ابتدائی مراحل طے کرنے میں وہ دقتیں پیش نہیں آئیں۔ جو دوسری زبانوں کو اس درجہ تک پہنچنے میں اُٹھانی پڑیں۔ اُردو میں راستہ بنا بنایا اور صاف تھا اور دوسری زبانوں میں نئی داغ بیل ڈالنے کی ضرورت تھی۔

یونانی اور لاطینی زبانوں کے رزم نگار شاعر تشبیہ کے بہت ہی شائق تھے۔ سپنسر، ملٹن، میاتھیو ارنلڈ نے ان کی تقلید کی۔ اس طرح انگریزی زبان میں اردو کی طرح یہ جائداد ورثہ میں آئی اور انھوں نے اسکا استعمال اچھا کیا۔ یہی حال دیگر صنائع بدائع کا ہے۔

سید وقار احمد۔ بی۔ اے (عثمانیہ)

محبت انسانیت کا مذہب ہے۔

عمل ہی سے اس دُنیا میں خوشی ہے اور بغیر عمل کے جنت بھی جہنم ہے۔

ایک بڑے کام کی کوشش بھی قابل تحسین ہے۔

آزادی اُنہیں کو ملتی ہے جو آزادی سے محبت رکھتے ہیں۔

خورشید و قمر

"دیکھنا دیکھنا کیسے بے حیا بے غیرت لوگ ہیں" ایک بڈھے نے دوسرے سے کہا۔

دوسرا بولا "نعوذ باللہ! روز روشن، چاندنی چوک کا بازار، گھما گھمی کا وقت، نعوذ باللہ استغفر اللہ خدا کرے یہ لوگ مسلمان نہ ہوں ورنہ میں تو جیتے جی مر مٹا۔ وضع تو بالکل پارسیوں کی سی ہے ہونگے بھی وہی"۔

پہلے نے کہا "میں پرسوں انہیں دریا کے کنارے ٹہلتے بھی دیکھ چکا ہوں۔ واقعی مسلمان شریف بیبیاں ایسا کام کیوں کرنے لگیں اُنہیں اپنے گھر سے واسطہ خدا رسول کا ڈر شوہر کی اطاعت اور بچوں کی پرورش مدِنظر۔ بھلا کوئی مسلمان ایسا کام کرسکتا ہے"؟

ساتھ کا ایک نوجوان گویا ہوا "چچا جان! سچ پوچھئے تو ہیں تو مسلمان، اب آپ جانیں آپ کا کام"۔

دوسرا بڈھا "یہ کیونکر پتہ لگا"؟

نوجوان "میں جانتا ہوں یہ اک میرٹھ کے نووارد بیرسٹر ہیں جو ابھی رائے سینا میں آکر ٹھیرے ہیں"۔

پہلا بڈھا "اور یہ شوخ دیدہ عورت کون تھی"؟

نوجوان "اُن کی بیوی۔ شوخی شرارت تو آپ سمجھیں مجھے تو اک شریف زادی معلوم ہوتی ہیں"۔

بڈھا "شریف زادی! کیا ارے میاں شریف زادی کے معنی بھی یاد ہیں۔ کہیں شریف زادیاں بھی موٹر میں بے پردہ بازاروں کی گشت کیا کرتی ہیں۔ ایف اے پاس کر کے تمہاری عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا۔ ابھی سے یہ حال ہے تو آئندہ کیا حشر ہوگا"؟

نوجوان "جناب معاف فرمایئے میری عقل کے آپ کیوں پیچھے پڑ گئے۔ خیر آپ بزرگ ہیں جو کہنا ہو کہہ لیجئے۔ دیکھئے وہ موٹر کھڑی ہوگئی میرے خیال میں فتحپوری کے نیچے میوے والے پٹھان کی دوکان کے پاس کھڑے ہیں"۔

دوسرا بڈھا "چلئے چلئے ذرا دیکھیں تو"۔

پہلا بڈھا "اے لو! وہ بیحیا بھی اُتر پڑی"۔

نوجوان "جی ہاں! اب لوگوں کی من مانی مرادیں پوری ہونگی دیکھئے پردہ پسند کیسے کنکھیوں سے دیکھتے ہیں!

پہلا بڈھا:- "دیکھیں نہ تو کیا کریں اندھے ہوجائیں" ؟

نوجوان:- "سود لینا دینا دونوں حرام۔ رشوت لینا دینا دونوں حرام۔ پردہ نہ کرنا بُرا پھر پردے دار کو دیکھنا کیونکر بھلا ٹھیرا؟ آپ نظریں نیچی کئے گذر جائیے"۔

دوسرا بڈھا:- "بھئی تم تو بے نماز ہو۔ تھوڑی دیر میں ہماری نماز کا وقت ہے مسجد سامنے ہے لو ہم جاتے ہیں" یہ کہہ کر دونوں بڈھے موٹر کے پاس سے ہوکر مسجد کے دروازے پر اپنے جوتے اُتار کے اندر داخل ہونے لگے۔ دونوں بڈھوں نے نظر بھر کر خاتون کو دیکھا اور ایک ایک ٹھنڈی سانس بھر کر مسجد میں قدم رکھا۔ نوجوان جلد ہی پاس سے گذر گیا کہ اُس نے پہلے بھی لاہور میں بہت سی خاتونوں کو بے پردہ ٹہلتے اور جلسوں میں شرکت کرتے دیکھا تھا۔

موٹر چلی تو خاتون نے کہا "مجھے اس پٹھان کی باتیں ہمیشہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں پٹھان درشت مزاج اور اکھڑ ہیں ان کی ہندوستانی گفتگو تو بہت نرم و شیریں ہوتی ہے۔ بوت (بہت) سستا اے (ہے)، بوت میٹا (میٹھا) اے" کوئی کرخت آواز ان کے منہ سے نکلتی معلوم نہیں ہوتی۔

جواب ملا "ڈیئر! تم وہی بھولی بھالی قمر ہو ظاہر سے دھوکا کھا جاتی ہو باطن کو نہیں سمجھتیں۔ اگر ان میں اتنی شیرینی ہوتی تو انگریز کبھی کا انہیں ہضم کر چکے ہوتے۔ (ساڑھی کی طرف دیکھ کر) "بائی جوو" (واللہ) میرا خیال غلط تھا یہ ساڑھی واقعی خوش رنگ ہے۔

قمر:- جی آپ کے بہت سے اور خیال بھی ابھی غلط ثابت ہونے والے ہیں۔ صرف اس لئے کہ جوگی جنہیں آپ فریبی اور جاہل پکارتے ہیں اس رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں آپ اس رنگ کو بُرا سمجھ بیٹھے۔ یاد رکھیئے بہت سی سادگیوں کے تحت میں خوبصورتیاں چھپی ہوئی ہیں۔

شوہر نے ہنس کر کہا "یہ میں ماننے کو تیار ہوں کہ بعض Simple things (سادہ) چیزیں خوبصورتی پیدا کرتی ہیں۔ خورشید سادہ سہی اور قمر خوبصورت لیکن قمر کے چہرے کا حُسن خورشید کے دل کی روشنی کا عکس ہے۔

قمر:- جی ہاں آپ مردوں کا یہ مشغلہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی برتری ثابت کرتے رہیں۔

خورشید:- میں برتر کہاں بنتا ہوں؟ میں تو بیسیوں بار تمکو اوروں کے سامنے اپنا Better half (نصف بہتر) کہہ چکا ہوں۔

قمر:- میں اس اشتہار بازی سے باز آئی۔ آپکے یہ چوچلے مجھے پسند نہیں۔ آگے آپ مالک ہیں۔

خورشید:۔ یہ ساری Universe (کائنات) یہ دُنیا ہماری یہ زندگی سب اشتہار بازی تو ہے۔ بے پردگی ہے۔ وہ پردے کا زمانہ ہو چکا اب ان خیالوں کو چھوڑو "

قمر:۔ اپنی منطق تو جیسی چاہیئے بھگار یئے مگر اپنے علموں کو ایسے عملوں سے بچائے رکھیئے تو بہت ممنون ہونگی۔

خورشید:۔ (دل میں) آج کا ڈنر شاندار ہوگا (قمر سے) میں نے عباس سے ٹیلیفون پر دریافت کیا تھا کہ میز پر کتنے Guests (مہمان) ہونگے انہوں نے بتایا پچیس۔ تمہاری Seat (نشست) کرنل داس کے پاس ہے۔

قمر:۔ خدا کرے آپ کا داس آپ کے چند سے بہتر ہو ورنہ میرا رویہ وہی ہوگا جو اُس روز تھا۔

خورشید:۔ Dear (عزیز ترین) اپنی متانت کو ذرا کم کرو ورنہ Social circle (دائرہ معاشرت) میں ہمارا گذارہ مشکل ہوگا۔

اتنے میں موٹر میڈنز ہوٹل کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ دونوں نے اپنا اپنا کوٹ سنبھالا اور عباس نے ڈیوڑھی میں How do you (مزاج شریف) کہہ کر اُن کا خیر مقدم کیا اور جدید ترین مغربی طریقے پر بڑے شد و مد سے مصافحہ کر کے انبساطِ ملاقات ظاہر کیا۔

۲

کھانا پینا نوعِ انسان کی سب سے زیادہ کمزوری ہے۔ اسی لئے دُنیا کے سب جھگڑے اسی سے آپس کے مقابلے نفس پروری طمع و حرص قومی جنگ و جدل ظہور میں آتے ہیں۔ اگر یہ کمزوری نہ ہوتی تو انسان کبھی کا فرشتہ ہو چکا ہوتا مگر ارتقا کی سواری کچھ ایسی سُست رفتار اور بے اختیار ہے کہ الاماں قدرت کی عادت انسان کو مفت میں خراب و خستہ حال کرنا ہے۔ ٹانگیں ہوتیں چلنے کے لئے ہاتھ ہوتے کام کاج کے لئے۔ ناک سونگھنے کان سننے آنکھیں دیکھنے اور دماغ سوچنے کے لئے تو سب ٹھیک تھے لیکن مُنہ غریب سے دو کام لے لئے بولنا بھی اور کھانا بھی اور یہ کس کی خاطر اُس نکمّے پیٹ کی خاطر جس کے یہ سارے دھندے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ وحشی اور غیر مہذب قوموں پر منحصر نہیں بلکہ اکثر تعلیمیافتہ تمدن یافتہ لوگ بھی اس معاملے میں حواس باختہ ثابت ہو چکے ہیں۔ انکی سب دوڑ دھوپ ان کے سب لکچر و کچران کے سب علم و فن انکی سائنسیں انکے آرٹ انکے کاروبار غرض ساری کی ساری تمدنی

مصروفیتیں اُسی پُرانے پیٹ کی خاطر۔ صرف ان لوگوں نے اس بھٹنے پر بہت سے پردے ڈال رکھے ہیں لیکن پردے اتنے باریک ہیں کہ اُس کی کارستانی اَور بھی عُریاں ہوجاتی ہے + معاشرت دوستی مطلب برآری سب اسی کے ذریعے اور اسی کے واسطے ہیں۔ بعض ہندوستانی کتنے پیٹو ہوتے ہیں اور انگریزوں کا تو کچھ نہ پُوچھیے کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ انگریز سے کام نکالنا ہو تو اُسے خوب کھلاؤ پلاؤ۔ وزیر ہند نے رشوت ستانی کی ہزار ممانعت کی تحفوں کا لینا دینا حاکموں محکوموں کے مابین بند کردیا لیکن یہ نہ سُوجھی کہ اپنے ہموطنوں کو سیدھی راہ پر لانا ہو تو انکے کھانے بند کئے جائیں +

ہمارے دوست عباس بڑے زمانہ شناس اور ماہر تمدن تھے۔ چند ہندوستانی بھائیوں کو بُلایا اور چند انگریزوں کو بھی جن سے کچھ مطلب تھا یا جو ایسی "مطلوبہ" ہستیوں کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے + عباس بھی بیرسٹر تھے لیکن فقط علمی بیرسٹر تھے عملی نہ تھے۔ ولایت گئے تھے کیونکہ آج کل کا کوئی نوجوان جس کے باپ کی آمدنی تین سو روپیہ ماہوار سے زائد ہو اپنے باپ کو چین نہیں لینے دیتا جبتک عزت کے ساتھ اُسے سمندر پار نہ بھیجا جائے انگلستان میں بیرسٹری پاس کی کیونکہ اَور کسی امتحان میں پاس ہونیکے وہ قابل نہ تھے۔ اسکے علاوہ لندن میں رہنا شام کو پکیڈلی کے چوک میں نظارہ بازی کرنا رات کو "قانونی سرائے" میں قانونی طعام نوش جاں فرمانا جہاں انہیں کی طرح کے اَور بیکار طلبا ہوتے تھے اور مفت کی شراب ملتی جس کے وجود نے بچارے مسلمان قاضیوں کو مفت میں بدنام کر رکھا ہے + ایک انگریزی قبیلے میں قیام تھا جو انہیں جیسا کہ اکثر انگلستان کے رہنے والوں کا قاعدہ ہے ایک ہندوستانی شہزادہ سمجھتے اور انکے فرضی مرتبے کے مطابق انکا احترام کرتے تھے۔ اِدھر انہوں نے بھی اپنا نام ایم۔ اے۔ کے عباس آف جہان آباد ظاہر کیا تھا۔ اس تمام شان وشوکت کے بعد تحصیل وہی دقیانوسی عالمگیر بیرسٹری جس کی تعریف ہمارے اک دوست نے یہ کہہ کر کی ہے کہ ڈھیلا اُٹھاؤ تو نیچے سے بیرسٹر نکل پڑتا ہے + وطن پہنچ کر مسٹر عباس نے دو چار ماہ بیرسٹری کی تجارت کی لیکن بازار سرد دیکھ کر ٹھیکیداری کی ٹھان لی اور دہلی پہنچکر رائے سینا کی مجوزہ تعمیرات کا مطالعہ کرنے لگے + اِسی سلسلے میں یہ دعوت دی گئی تاکہ حکام بالادست سے رسوخ پیدا ہوجائے۔ انجینئروں اور دیگر سرکاری عاملوں کی شرح نذرانہ تو انہیں پہلے سے معلوم ہو ہی گئی تھی وہ راستہ صاف تھا اور انکی جیب بھی نری خالی نہ تھی لیکن سیم وزر کی چمک دمک کے ساتھ اگر پیٹ کی تھوڑی سی مالش بھی ہوجائے تو مہذب شخص کے دل و دماغ دونوں مل کر موانست و موافقت کی راہ پر آجاتے ہیں +

مہمان ایک ایک کرکے آنے لگے بیس بیاہے ہُوئے اور پانچ کنوارے مدعو کئے گئے تھے جنٹلمین اور لیڈیاں زرق برق کے "طعامی" لباسوں میں نمودار ہُوئے + سوائے نواب آف شاہدرہ راجہ آف تغلق آباد اَور

مسٹر چودھری کے (وہ اپنے تئیں مسٹر چاؤڈری کہتے تھے) باقی سب مرد انگریزی "طعامی" لباس پہنے ہُوئے تھے انگریزی خواتین کے لباس جدید ترین فیشن کے مطابق کٹے پھٹے تھے باہیں بغلوں سمیت عُریاں سینہ ½ حصہ عریاں اور گردن کے نیچے جسم کا پچھلا حصہ بھی اُسی مناسبت سے صاف عیاں تھا۔ لمبے موزے اکثر جسمانی رنگ کے تھے اکثروں کا سارا لباس نہایت باریک اور تُنک تھا۔ چہرے پر سفیدہ اور دو ایک کے لبوں پر سُرخی بھی تھی اور کان سب کے بالوں سے ڈھکے ہُوئے تھے۔ کرنل داس جو کوئیٹہ کے ایک فوجی افسر تھے بائیں آنکھ پر "مانوکل" (چشمی شیشہ) لگائے داخل ہُوئے اور مسز داس جو ایک شرمیلی تعلیمیافتہ خاتون تھیں اپنے شوہر کے ہمراہ آئیں۔ ایک پارسی گنجے بزرگ مسٹر جمشید جی اور اُنکی نوجوان صاحبزادی شیرین جمشید جی ایک نفیس موٹر کار سے اُترے جس کی پُشت پر ۴۱۳۷ Bom ڈ لکھا تھا۔ سب لوگ ہوٹل کے گول کمرے میں جمع ہو کر گٹ بٹ انگریزی بولنے لگے۔ تعارف میں گردنیں جھکنے اور آوازیں بلند ہونے لگیں اور بے معنی گفتگوئیں ہر طرف چھڑ گئیں "یہ موسم اچھا ہے" "وائیسرائے کی کھانسی پہلے سے کم ہے" "آپ کب سے یہاں مقیم ہیں" "میری گھڑی دو منٹ پیچھے ہے" ان عقلمندوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ نواب آف شاہدرہ کسی اُلو کی مانند بڑی بڑی آنکھیں کھول کر حاضرین کا جائزہ لے رہے تھے اور راجہ آف تغلق آباد کے اندر کو گھُسے ہُوئے گال کسی اشوکی مینار کے کتبے کی طرح ایک عالمِ اثریات کے لئے موضوعِ تفتیش بن سکتے تھے۔

جب سب مہمان آ گئے تو میزبان نے لیڈی بیکن سے باادب درخواست کی کہ کھانیکے لئے تشریف لے چلیں۔ وہ اپنے سبز سایہ کی دُم کو سنبھالتی ہُوئی کھانیکے کمرے میں داخل ہُوئی اُسکے پیچھے دیگر خواتین تھیں اُن کے پیچھے حکام اُنکے پیچھے خطاب یافتہ لوگ اور اخیر میں عام متنفس انسان۔ عباس کو اس جلوس کے ترتیب دینے میں کوئی زحمت نہ اُٹھانی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس قسم کی کارروائی کے خوگر ہیں اور "آپ پہلے" "میں پیچھے" کہنے کی ان کو ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ایوانِ طعام میں پہنچکر ہر شخص نے مُلاقاتی کارڈوں پر ٹائپ شدہ ناموں کا مطالعہ کر کے اپنی اپنی نشست پالی اور بیٹھ گئے۔ آٹھ "بَہرے" اور تین "آبدار" کھانے پینے کی چیزیں لیکر آنے جانے لگے اور میز سے انگریزی ڈنر کی شان ٹپکنے لگی۔ میز کے وسط میں مسٹر عباس تھے اُنکے دائیں لیڈی بیکن چیف انجینئر کی بیوی اور اُنکے بائیں مسز اولڈ ہیسیڈ بیٹھی تھیں کرنل داس مسز خورشید کے دائیں ہاتھ تھے اور مسٹر خورشید کے بائیں طرف شیرین جمشید جی اور ان کے بائیں طرف مسٹر "چاؤڈری" متمکن تھے۔

کرنل داس نے کہا مسز خورشید! آپکے شوہر اور میں کیمبرج میں ایک ہی زمانے میں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ میں نے آپکے شوہر سے زیادہ بامذاق آدمی کم دیکھا ہے۔ وہ اہلِ دُنیا کو پہچانتے ہیں۔ نہایت "اپ ٹو ڈیٹ" ہیں۔

مسز خورشید:۔ صاحب! آپکی عنایت ہے"۔

کرنل داس:۔ میرے متعلق آپ اُن سے دریافت کرسکتی ہیں کہ لوگوں کی میری بابت کیا رائے تھی؟"

اتنے میں آبدار دو رنگین صُراحیاں اُٹھائے لایا اور بولا "کلیرٹ" "وسکی"۔ کرنل نے جو گھر پر اپنے نوکروں کو گالیاں دینے میں اک اچھا خاصہ مقرر تھا کہا "نو تھینک یو" (نہیں! آپکی عنایت) قمر نے جی میں کہا میرا خیال غلط تھا میں بھی لوگوں کو بغیر جانے بوجھے اُنکے متعلق رائے قائم کرلیا کرتی ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے۔ بیچارا کسقدر نیک ہے اور کیسا حلیم الطبع۔ یہ ضرور انگلستان میں اپنا کام اچھی طرح نباہتا رہا ہوگا۔

کرنل داس:۔ میرے کمرے کا دروازہ ہر کہ ومہ کے لئے کھُلا رہتا تھا"۔

مسز خورشید:۔ (ذرا توجہ سے) انسان کو دُنیا میں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ ہمکو اپنے پُرانے طریقے کبھی ترک نہ کرنے چاہئیں"۔

کرنل داس:۔ ہاں اور اُنکے ساتھ جو نئی باتیں بھی قابلِ تقلید ہوں اُن کو سیکھنا چاہیئے"۔

اتنے میں آبدار نمبر ۲ آیا اور کہا "حضور شیمپین" کرنل نے اپنے جام میں ڈالنے کا اشارہ کیا پھر مسز خورشید سے کہا نوشِ جاں فرمایئے اُس نے ذرا چیں بہ جبیں ہوکر کہا مجھے معاف فرمایئے"۔

کرنل داس:۔ ہاں ہاں میں بھول ہی گیا آپکے مذہب میں بہت سے لوگ اسے ناجائز سمجھتے ہیں"۔

مسز خورشید:۔ ہمارا مذہب خود اسے ناجائز اور ممنوع قرار دیتا ہے۔ بہت سے لوگوں سے آپکا کیا مطلب؟

کرنل داس:۔ ہندوستان میں ہمارے بعض بعض مُسلمان بھائی جو تعلیم پا چکے ہیں تھوڑی بہت پیتے ہیں اور خاص اسلامی ملکوں میں تو اب اس کا خاصا رواج ہوچلا ہے (مسکراکر) میں سنتا ہوں کہ آپ کے بعض ترکی رہنماؤں کے ہونٹ بھی مغربی شرابوں سے لال رہتے ہیں۔ (آبدار نے تھوڑی سی اور شراب ڈالدی)۔

مسز خورشید:۔ جناب اسلام ترکیت یا ایرانیت یا عربیت یا ہندیت نہیں ہے۔

کرنل داس:۔ لیکن مجھے یہ پوچھنے کی اجازت دیجئے کہ آخر تھوڑی سی پینے میں حرج کیا ہے طاقت کے لئے ہاضمے کے لئے مل کر بیٹھنے مل کر باتیں کرنے کے لئے ذراسی پی لی تو کیا آسمان ٹوٹ پڑا۔ جیسے اور پینے کی چیزیں ہیں ویسی ہی یہ بھی ہے۔

مسز خورشید "جی ہاں طاقت کے لئے ہاضمے کے لئے اور مل بیٹھنے اور بات چیت کرنے کی یہی تو اک ترکیب ہے"

کرنل داس: (یہ سمجھ کر کہ لیڈی سے زیادہ بحثنا تہذیب حاضرہ کے منافی ہے) یہ میں ماننے کو تیار ہوں کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کا اختیار ہے یہی تو موجودہ تمدن کی خوبی ہے کہ اس میں کسی امر کی مجبوری نہیں۔ جو جس کے جی میں آئے کرے مجھے یہ بہت پسند ہے۔

گفتگو کا سلسلہ ذرا ٹوٹا تو مسز خورشید کے بائیں ہاتھ مسٹر اولڈ ہسبینڈ نے کہا مجھے دہلی کا موسم سرما بہت پسند ہے قدسیہ باغ میں شام کو ٹینس کا کتنا لطف ہوتا ہے۔ میں نے آپکو بھی وہاں کھیلتے دیکھا ہے

مسز خورشید "ہاں! میں کبھی کبھی کھیلا کرتی ہوں مجھے یہ انگریزی کھیل بہت پسند ہے۔ کھلی ہوا میں باغ میں ورزش کرنا عورتوں کے نصیب میں نہیں۔ اے کاش ہندوستانی اس معاملے میں ذرا فراخدلی سے کام لیں۔

مسٹر اولڈ ہسبینڈ "جبتک ہندوستانی لوگ متمدن ہو کر آزاد خیالی سے زندگی بسر نہ کریں گے ترقی نہ کرسکینگے۔ وحشیانہ رسوم کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

مسز خورشید "اپنے پرانے خیال کے لوگوں کو بھی میں وحشی تو کبھی نہ کہونگی اور بعض آزاد خیالیوں سے بھی ہم بچے ہی رہیں تو بہتر ہے لیکن آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض رسوم نے ہماری قومی زندگی کو دبا رکھا ہے

مسٹر اولڈ ہسبینڈ "آپ سی روشن خیال خاتونیں ہی نئی روشنی کا نمونہ بن سکتی ہیں۔ اگر اسی طرح آپکی سب بہنیں انگریزی تعلیم پائیں تو آپکے گھروں سے قدامت پسندی کا قدم اٹھ جائے۔

مسز خورشید " ہماری ترقی کا مسئلہ میرے خیال میں صرف مغرب کی تقلید سے حل نہیں ہوسکتا لیکن مغرب سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ضرور ہے۔ آپ کی سی مشغولیت آپ کا سا استقلال آپ کی سی قومی حمیت ابھی میں اپنے وطن میں نہیں دیکھتی۔

میز کے دوسرے کونے کی طرف فضا اتنی سنجیدہ و متین نہ تھی۔ وہاں سے ہنسی کی آوازیں اور قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ مسٹر خورشید مس رستم جی کی باتوں میں منہمک معلوم ہوتے تھے۔

مس جمشید جی "میں کل وائسرائے کے ہاں کھانے پر گئی۔ لیڈیوں کا لباس انتہا درجہ شاندار تھا میری ساری کی وہاں بڑی تعریفیں ہوئیں"

مسٹر خورشید "آج بھی تو آپکی ساری نہایت خوبصورت ہے"

مس جمشید جی "اگر وہ کل والی ساری میں آج پہنے ہوتی تو آپکی نظر میرے سوا کسی اور پر نہ پڑتی (قہقہہ لگایا)"

مسٹر چودھری "(مسٹر خورشید سے سنجیدگی کے ساتھ) گویا مس رستم جی کو شکایت ہے کہ آپ نے اپنی بے توجہی سے اُنکی ہتک کی ہے"

خورشید "معاف فرمائیے اگر میں نے آدابِ مجلس کی خلاف ورزی کی ہے"

مس جمشید جی "نہیں نہیں یہ تو آپ کو بناتے ہیں میں آپسے خفا نہیں (ہنس کر) اور نہ اِن سے ناراض ہوں"

مسٹر چودہری "آپکے خاندان کے متعلق مس رستم جی میں نے بہت سی دل خوش کن باتیں سُنی ہیں"

خورشید "آپ بہ نفسِ نفیس اپنے خاندان کا آئینہ ہیں"

مس جمشید جی "آجکل زندگی کافی لطف سے نہیں گذرتی۔ گذشتہ سال میں پیرس کی سیر کو گئی۔ میری ایک عزیزہ بھی میرے ہمراہ تھی وہ پتلی دُبلی بچاری تو سوئٹزرلینڈ کی ایک صحت گاہ میں صحت حاصل کرنے کو چلی گئی میں اپنے والدین کے ہمراہ پیرس اور لندن میں مقیم رہی۔ کیا کہوں جو کچھ دیکھا حسن و نقاشی کے بہترین چلتے پھرتے نمونے جو میں نے پیرس میں دیکھے ہیں کہیں نظر نہیں آسکتے۔ وہ مُولاں روژ (سُرخ چکی) کی رنگ آفرینیاں وہ اوپرا (راگ گھر) موسیقی وہ شاں زیلزی کی شان و دلاویزی مجھے نہیں بھولتی پر نہیں بھولتی۔ اس گلستاں کی سیر کے بعد آکر اس کیچڑ میں پھنس جانا غضب ہے۔ میری زندگی تو سخت بے لُطف ہے"

مسٹر چودہری "خدا نہ کرے! آپ مغموم تو نہیں رہتیں آپ کو کوئی فکر تو نہیں؟"

مس جمشید جی "غم کے سر سینگ نہیں ہوتے فکر کسی بُت کا نام نہیں جو انسان خریدنے جائے لیکن جب روزانہ زندگی میں لطف و مسرت کے سامان نہ ہوں تو زندگی زندگی نہیں۔ بمبئی میں خیر بہت سے کلب ہیں، ہفتے میں پانچ دفعہ میں اپنے کلب میں روز دو چار گھنٹے تاش کھیلتی ہوں ایک آدھ گھنٹہ ٹینس کھیلتی ہوں۔ ہر روز کہیں نہ کہیں چائے یا کھانے پر جانا ہوتا ہے۔ پیر اور بدھ اور ہفتے کے روز عموماً تھیئٹر یا سینما سب اکٹھے جاتے ہیں یا کبھی کوئی دوست تماشے پر لیجاتا ہے لیکن خدا بچائے یہ دہلی تو فرغت

کا جہنم ہے نہ کام نہ کاج صرف ایک دفعہ ہفتے میں سینما دوسری دفعہ جاؤ تو وہی تصویریں۔ بمشکل ہفتے میں ایک بار ناچ۔ کبھی کبھی کوئی engagement (ملاقات) ہوتی ہے" + اتنے میں مسٹر عباس نے اُٹھ کر کہا لیڈیز اینڈ جنٹلمین دپھر اپنے شراب کے گلاس کو بلند کرکے کہا "ہز میجسٹی دی کنگ"۔ سب نے کھڑے ہوکر کہا "دی کنگ" بعض ہندوستانیوں نے کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ کسی نے سچ مچ کسی نے جھوٹ موٹ جامِ صحت نوش فرمایا

مسٹر چودھری:۔ (مس رستم جی کے جواب میں)۔ مجھے افسوس ہے کہ آپکے دن یوں ہی دلچسپی سے خالی ہیں، واقعی ہم کلکتے بمبئی والوں کے لئے شمالی ہند کے یہ شہر بیابان کا نمونہ ہیں میں آپ سے قطعی طور پر اتفاق کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں ہم جنٹلمینوں کا فرض ہے کہ آپ جیسی روشنضمیر لیڈیوں کے لئے دلچسپی کا سامان بہم پہنچائیں +

مس جمشید جی:۔ (خورشید کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر) تو یہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ ہم بدیسیوں کی مدد کریں +

شیریں جمشید جی نہایت حسین اور خوش وضع خاتون تھی۔ اُس کا اندازِ گفتگو اُس کی جادو بھری نگاہ اُسکے غلط انداز غمزے حُسن پسند نوجوانوں کے دل پر تیر و نشتر کی بارش کرتے تھے + شیریں کو بنگالی کے پامالِ سیاست چہرے میں ذرا دلکشی نظر نہ آئی لیکن خورشید پر اُس کا دل پسیجا باوجودیکہ بنگالی ابھی کنوارا اور پنجابی بیاہا ہوا تھا لیکن ان حالات کی شیریں کو کیا پروا تھی۔ دوراندیشی اکثر حُسن کا وصف نہیں ہوتا اور لگاوٹ کا تو نام ہی ناعاقبت اندیشی ہے +

خورشید:۔ نیک دل لیکن حُسن و مسرت کے لئے ذرا کمزور دل واقع ہُوا تھا۔ اُس کا دل اس ٹھیس سے زخمی ہوگیا کہ ایسی حسین لڑکی غربت میں اکیلی اور بے یار و مددگار ہو۔ ذرا تامل کے بعد جواب دیا "ہم کبھی گوارا نہیں کرسکتے کہ آپ کو تکلیف ہو"

مِس جمشید جی:۔ رنج و تکلیف کے ذکر سے مجھے نفرت ہے + ہاں کہئیے آپ "برج" (تاش کا ایک کھیل) کھیلتے ہیں؟

خورشید:۔ بے شک۔ میرے ہندو دوستوں نے میرا نام برج نرائن رکھا ہے +

مس جمشید جی:۔ تو اپنے میزبان سے اجازت لیکر کھانے کے بعد ہم برج کھیلیں گے +

مسٹر چودھری:۔ لیکن آج کھانے کے بعد یہاں ناچ ہے +

مس جمشید جی:۔ اہا! مسٹر خورشید کیا آپ ناچتے ہیں؟

نواب شاہد رہ جو بالمقابل بیٹھے تھے ناچ کا نام سُن کر بدکے اور نعوذ باللہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مسز داس سمجھیں کھانے میں کوئی خرابی ہے۔ لیڈی بیکن سمجھیں نواب صاحب اُن سے مخاطب ہونا چاہتے ہیں کہا Beg your pardon ؟ (کیا ارشاد ہُوا؟) نواب صاحب چیخ اُٹھے۔ "لیڈی صاحبہ"! لیڈی صاحبہ حیران سی رہ گئیں کہ کیا ماجرا ہے؟

مسٹر خورشید:۔ (مس جمشید جی سے) نہیں میں ناچتا نہیں۔ ہمارے خاندان میں یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی ہے۔

مس جمشید جی:۔ لیکن آپ کا خاندان تو ہندوستان ہی میں ہوگا۔ آپ لندن پیرس میں بھی کبھی نہیں ناچے؟

مسٹر خورشید:۔ اب تو میں کبھی نہیں ناچتا۔

مس جمشید جی:۔ (یہ دیکھ کر کہ وہ رضامند نہیں) اچھا تو ہم تاش ہی کھیلیں گے مجھے بھی آج ناچنے کی خواہش نہیں۔ دس روپے فی صدی کھیلیں گے مسٹر چودھری خلوت کا یہ رنگ دیکھ کر جلوت سے الگ ہو گئے اور مسز داس سے باتیں کرنے لگے۔

اتنے میں کھانا ختم ہُوا۔ پہلے لیڈیاں اُٹھیں اور گول کمرے میں جا کر آپس میں نسوانی سی باتیں کرنے لگیں مسز داس اور مسز خورشید بہت جلد اک دوسرے سے بے تکلف ہو گئیں اور اک دوسرے سے اکثر ملتے رہنے کی ٹھان لی۔ مرد کھانے کی میز کے گرد بیٹھے سیگرٹ سگار اور شرابیں پیتے رہے۔ آدھ گھنٹے کے بعد سب لوگ ناچ کمرے میں جمع ہوئے۔ ناچنے والے اور ناچنے والیاں اپنے اپنے "ناچ کاغذ" سنبھالے اک دوسرے سے پوچھ پوچھ کر اپنا تقسیم اوقات بنا رہے تھے نہ ناچ سکنے والے کمرے کے گرداگرد کُرسیاں بچھائے نظارۂ رقص کا انتظار کرنے لگے۔ مس رستم جی اور خورشید اور دو اور کھلاڑی میزبان کی اجازت لیکر ساتھ کے کمرے میں تاش میں منہمک ہو گئے۔ مسز خورشید گھبرائی ہُوئی اِدھر اُدھر اپنے شوہر کو ڈھونڈھ رہی تھی کہ مسز داس نے پاس آکر کہا معاف کیجئے آپ کو کیا تشویش ہے؟ انہوں نے سوال کیا میرا شوہر؟ جواب ملا وہ تاش کمرے میں تاش کھیل رہے ہیں گھبراؤ مت میں ذمہ وار ہوں۔ مسز خورشید مُسکرائیں اور پھر باتوں میں لگ گئیں۔

۳

موٹر میں سوار ہو کر اپنی کوٹھی کو چلے تو خورشید نے کہا "کس قدر نفیس کھانا اور کیسے اچھے لوگ تھے"۔
قمر نے کہا "اچھے بُرے کی صحیح پہچان تو خدا ہی کو ہے لیکن ان کی سب باتیں تو اچھی نہ تھیں۔ جُوا کھیلنا

شریفوں کی عادت میں داخل نہیں"۔ قمر کچھ دیر سے پیچ و تاب کھا رہی تھی جو جی میں تھا آخر کہہ ہی دیا۔ اُسے شوہر سے محبت تھی اور شوہر نے اُسے آزادی بھی دے رکھی تھی۔ سو اُس کا ارادہ تھا کہ کسی بات کو شوہر سے چھپائے نہیں بلکہ اُس کی طرف سے دل میں جو میل ہو اُس پر صاف صاف ظاہر کر دے۔ خورشید آزاد خیال تھا عورتوں کی عزت کرتا تھا نئے مغربی طریقوں کو پسند کرتا تھا لیکن اس بات کو نہ سمجھ سکتا تھا کہ کوئی عورت کیونکر بندش کے خیالوں کو خود ہی پسند کرے؟ کیوں آزادی اور نشاطِ زندگی کی طرف خود بخود مائل نہ ہو؟ وہ کہتا تھا کہ ہمیں ہندوستانی عورتوں کو تربیت دینا آزادی کی سیدھی راہ پر لانا اور متمدن باتیں سکھانا ہے اُن کے دائرے کو وسیع تر کرنا اُن کے نقطۂ نظر کو درست کرنا ہے اور اُن کے جی سے اس بات کو مٹانا ہے کہ مردوں کے سامنے آنکھ اُٹھانا بیحیائی اور اُن سے بات تک کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ قمر تعلیمیافتہ تھی نئی تعلیم اس پر اثر کرچکی تھی لیکن اسلامی ہندی تمدن کا خمیر اُس کی فطرت میں ہنوز موجود تھا۔ قدم بڑھاتی تھی لیکن قدم قدم پر سوچتی تھی کہ میں کدھر جا رہی ہوں شوہر کی مرضی پر چلنا ضروری سمجھتی تھی لیکن جہاں وہ غلطی پر ہوتا اُس آزادی کی بنا پر جو اُسے حاصل تھی شوہر کو ٹوک بھی دیا کرتی۔

لیکن آج کی رات کچھ ایسی رات تھی کہ بیوی کی روک ٹوک خورشید کو بُری معلوم ہوئی۔ وہ کچھ عرصے سے قمر کو دیکھ رہا تھا کہ وہ بجائے قدم آگے کو بڑھانے کے پیچھے کو ہٹ رہی ہے۔ اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ نئی معاشرت سے وہ بعض اوقات متنفر نظر آتی ہے۔ اس سے وہ دل میں ناراض تھا لیکن جلد کوئی ایسا منصوبہ نہ باندھ سکتا تھا جو قمر کو جدید رستے پر لے آئے۔ آج اُسے موقع ملا۔ اُس نے ذرا جھنجھلا کر کہا "قمر تم ہر بات میں ہر شخص سے بدگمانی رکھتی ہو۔ نہیں معلوم یہ مشرقی عادت تم نے اپنے نانا سے سیکھی ہے، وہ خود عورتوں کو کنکھیوں سے دیکھنے میں مشاق تھے اور شاید اسی لئے جب کسی عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر دیکھتے تو فوراً کہہ اُٹھتے ہو نہ ہو یہ بدچلن ہے"۔

قمر:۔ "معاف فرمائیے میرے نانا جان اِس وقت آپ سے لڑ جھگڑ نہیں رہے"!

خورشید:۔ "تم جو اپنے نانا کی نمائندہ یہاں موجود ہو۔ جسے تم جُوا کھیلنا کہتی ہو وہ محض اک معصوم کھیل ہے۔ بھلا ذرا سوچو تو سہی کہ اگر تاش میں میں نے چار روپے جیت لئے یا ہار دئے تو کیا آفت آ گئی۔ میری نیت قمار بازی کی نہیں۔ میں دن بھر اپنا وقت اسی میں ضائع نہیں کرتا۔

قمر:۔ اسی طرح شراب پی لینا اور ناچنا بھی کیا بُرا ہے؟ ساری رات شراب کون پیتا ہے ہر روز کون

ناچیار ہتا ہے ؟

خورشید :- (غصے میں) مجھے معلوم نہ تھا کہ باوجود تعلیم کے تم اس قدر narrow minded (تنگ خیال) ہو میری زندگی خراب ہو جائے گی اور اس کا باعث صرف تم ہوگی ۰

مرد جو عورتوں کو قول و فعل کی آزادی دینے کے مدعی ہیں کم از کم مشرق میں اپنے دعوے کے ثبوت میں اکثر اپنے عملوں کو پیش نہیں کر سکتے بعض باتوں میں نئے تعلیمیافتہ زن مرید ہوں لیکن ابھی مردانہ حکومت کی بُو اُن سب کے دماغ سے نہیں گئی۔ خورشید کے الفاظ سے زیادہ اُسکے بُشرے نے قمر کو خاموش کر دیا۔ وہ تاڑ گئی کہ خورشید کا میلان طبع کس طرف کو ہے ۰ دونوں موٹر میں خاموش رہے اور اسی طرح گھر پہنچے۔ خورشید عمداً قمر سے الگ دوسرے کمرے میں سونے کو چلا گیا ۰ دونوں اپنے اپنے کمرے میں اپنے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ اس تشویش و خفگی میں نیند کیسے آتی۔ تین چار گھڑی دونوں کروٹیں بدلتے رہے ۰

خورشید جی میں کہہ رہا تھا "میں نے ایسی عورت کبھی نہیں دیکھی۔ صدیوں سے مشرقی عورتیں یہ رونا روتی آئی ہیں کہ مرد ہم پر ظلم و تعدی کرتے ہیں اپنے آپ کو ہمارا حاکم سمجھتے ہیں۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں جو جی میں آتا ہے کہتے ہیں ہماری نہیں سنتے اپنی ہانکتے ہیں ۰ عورت چار دیواری میں مقید ہے سورج کی جتنی روشنی فضا کی جتنی ہوا دیواروں کے اوپر سے اندر کو آسکے وہی اس کا نصیب۔ بچے جننا اُس کا کام نوکرانیوں سے لڑنا اُس کا مشغلہ کمروں کی صفائی گیہوں چاول کی خرید پیاز لہسن کا بیوپار دھوبن پنہاری کے جھگڑے یہ اس کے انتظام ۰ جاہل اور ضدی کا اُس کو خطاب دیا جاتا ہے پھر اگر چند ابتدائی کتابوں سے زیادہ پڑھنے لگے تو اُس پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ اُس کی کمزوری اور ناتجربہ کاری کی پھبتی اُڑائی جاتی ہے ساتھ ہی اندھیری کوٹھڑیوں کی غلیظ ہوا میں اُسے رکھا جاتا ہے اور گھر کی دیواریں ہی اُس کی زندگی کا افق ہیں یعنی بلبل کو پنجرے میں قید کر کے صیاد بڑی ہمدردی سے چلاتا ہے کہ ہائے تو اُڑ نہیں سکتی ۰ ہندوؤں نے عورت کی جو گت بنائی وہ ظاہر ہے۔ کیا ستی کیا بیوگی کیا مال و متاع سے محرومی اُس کی بُری حالت ہے۔ اُس کے اولاد ہوئی تو خاوند کے بعد اپنے لڑکوں کی دست نگر اور نہ ہوئی تو دونوں جہان میں اُس کا منہ کالا ۰ اسلام نے عورت کو حقوق دیئے مگر مسلمانوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ پنجاب والے تو ہندو دستور کے پابند ہو کر اُسے جائداد سے محروم رکھتے ہیں اور سبھی اُسکے مُنہ پر جہالت کے پردے ڈال کر اُسے اونچی اونچی دیواروں والے قیدخانوں میں مقید رکھتے ہیں اب وہ کرے تو کیا اور کہے تو کس سے ؟ ۰ عورت برقع اوڑھ کر بھی باہر نکلی اور حضرت کو شرم آنے لگی۔ اس سے تو

اُنکے کُتّے بلّیاں ہی زیادہ آزاد ہیں کہ آسمان کی ہوا روشنی سے تو لُطف اُٹھاتے ہیں + اس ظلم وستم کو ہمیں کم کرنا ہے اس سوئی ہُوئی دُنیا کو نئی روشنی کی چمک سے جگانا اس منجمد سوسائٹی کو اُمنگوں کی حرارت سے گرمانا ہے + مغرب کی مثال ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کے قدم بقدم چل کر ہی ترقی ممکن ہے۔ اسی طرح موجودہ دُنیا میں نشوونما ہوگی اسی طرح بیدار مغز قوموں کا مقابلہ ہوگا + لازم ہے کہ ہم اپنی مُقید عورتوں کو آزاد کریں لازم ہے کہ ہم اُن کو آزاد خیالی کی راہ پر لگائیں لازم ہے کہ وہ مہذب سوسائٹی میں مہذب لوگوں کی سی باتیں سیکھیں + انکے بجائے قمر قدامت کے گلے کا ہار ہو رہی ہے اُسے نئی باتوں سے گھن آتی ہے وہ آبائی پارسائی کی مشتاق ہے تارک الدنیا ہونا چاہتی ہے۔ میں نے اُسے تعلیمیافتہ سمجھ کر شریکِ زندگی بنایا۔ اب بجائے اسکے کہ وہ اپنی زندگی کو درست کرے اُلٹی میری زندگی کو ذلیل کرنے کے درپے ہے + کیا میں گھر میں قید ہو کے بیٹھ رہوں؟ کسی پارٹی میں جاؤں تو تاش کھیلنے سے انکار کردوں؟ ناچ کا نام سُن کر ناک بھوں چڑھاؤں؟ شراب کو دیکھتے ہی لاحول ولا کہنا شروع کردوں؟ آخر تاش میں کیا نقص ہے؟ ناچ میں کیا گناہ ہے؟ شراب میں کیسا کفر ہے؟ میں جُوا باز نہیں طوائف نہیں بادہ پرست نہیں پھر چند آنے ہارنے جیتنے میں اعضا موسیقی کے ساتھ ہلانے جلانے میں کسی اَور کھانے پینے کی شئے کی طرح انگور کا ست چکھ لینے میں مَیں نہیں جانتا کیا اخلاقی جُرم ہے؟ ہم ہندوستانیوں کی فطرت انتہا پسند ہے یا ہم شراب میں مستغرق عورت میں منہمک اسراف وعشرت میں مصروف ہیں یا لمبی ڈاڑھی کئے بدن پر راکھ ملے تسبیح لٹکائے سر دُھن رہے ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں ہم سب کچھ کریں۔ ہاں ذرا اعتدال سے۔ یُورپ والے اگر عیش وعشرت میں منہمک ہوتے تو اب تک برباد ہو چکے ہوتے۔ اور ہم اگر خدا کے بڑے پیارے ہوتے تو یوں ذلیل وخوار نہ ہوتے۔ نہ اُن میں اتنے نقص ہوتے۔ نہ ہم میں اتنی خوبیاں + میں قمر کے قید وبند سے اپنی جان کو عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر وہ سب نئی چیزوں سے احتراز کرنا چاہتی ہے تو کیا کرے۔ میں تو وہ کرونگا جو میرے جی میں آئے +

یہ تھے خورشید کے خیالات اُدھر قمر اپنے خیالوں میں غرق تھی + وہ سوچتی تھی کہ میں نے خورشید کے کہنے پر اپنے خیالوں کو بدلا جو باپ دادا نے سکھایا تھا بہت کچھ بُھلا یا۔ باپ نے اچھی تعلیم دی ہی تھی گرلز کالج کے دن میری زندگی کا جزو بن گئے۔ مجھے کچھ پُرانے خیالوں سے محبت نہیں۔ میں نے پردہ چھوڑا خلوت کا رواج توڑا کہ عورت کی دست نگری اور غلامی مجھے پسند ہی نہیں۔ خدا نے شوہر بھی ترقی پسند آزاد خیال دیا۔ شکر ہے کہ میں گھر کی چار دیواری میں مقید نہیں کسی پُرانی وضع کی ساس کے دن رات کے

طعنوں سے مجھے بچاؤ ہے۔ صرف بچوں نوکروں اور چھوٹوں کمیوں سے واسطہ نہیں بلکہ خدا کی روشنی اور ہوا کی نعمتیں مجھے میسر ہیں اور بافراط میسر ہیں + پردہ اچھی شے ہے مگر بدن کا پردہ نہ کہ آنکھ منہ کا پردہ قرآن مجید کی تعلیم کے معنے میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ اپنے بدن کو چھپائے رہو سوائے اُن حصّوں کے جو چار و ناچار کھُلے رہیں۔ آنکھ دیکھنے کے لئے ہے مُنہ کھانے اور بات چیت کرنے کے لئے، ناک سُونگھنے اور سانس لینے کے لئے۔ تو کیا یہ چار و ناچار نہیں کھُلے رہتے؟ انگریزوں اور بعض ہندو مسلمان خاتونوں کا ننگی باہیں اور ننگا سینہ رکھنا مجھے سخت ناپسند ہے نہ اس کی کچھ ضرورت ہے نہ یہ مناسب ہی ہے کہ عورتیں اپنے جسم کے زیادہ سے زیادہ حصے کی نمائش کریں لیکن کسی کاٹنے والے جانور یا مسخ شدہ انسان کی طرح یہ بھی کیا ضرور ہے کہ چہرے پر ایک پٹی یا پٹکا ہی باندھ کر عورت کو گھر کے پنجرے سے باہر نکالا جائے + میرے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمتیں تازہ ہوا سورج کی روشنی چاند کی چاندنی کھُلے میدان شگفتہ باغ ہیں۔ جو کوہستان۔ صحرا۔ ندی نالے بحرو بر اُس نے بنائے اُنہیں مرد دیکھے تو عورت نے کیا جرم کیا ہے کہ وہ نہ دیکھے۔ پھر دنیا کے سب مرد ہمارے بھائی اور سب عورتیں ہماری بہنیں نہیں کہ ہم اُن سے نہ ملیں جلیں؟ کیا سب مرد بُرے ہی ہیں کہ اُن سے دُور بھاگنا لازم ہو اور کیا سب عورتیں کمزوردل ہی ہیں کہ مرد کے سامنے گئیں اور موم ہو کر لگیں پگھلنے + خدا کو منظور ہے تو میں اپنی زندگی کو اپنی ہندوستانی بہنوں کی آزادی کے لئے وقف کر دوں گی + گھر سے باہر نکلنا چلنا پھرنا آنا جانا مجلسی آداب کے ساتھ مردوں عورتوں سے ملنا جلنا کسی کی سُننا اپنے جی کی کہنا یہ سب کچھ ہو اور خود داری متانت، حیاداری آزادی یہ ہم عورتوں کی زندگی کے چار عنصر ہوں + لیکن خورشید کہتے ہیں کہ میں میم بن جاؤں جو میمیں کریں وہ میں کروں۔ مردوں سے ہنسوں کھیلوں۔ جُوا شراب ناچ اِن کو بُرا نہ کہوں اور شاید ایک وہ دن بھی آجائے کہ وہ چاہیں میں اِن باتوں میں حصّہ لوں + خدا کی قسم جس نے مجھے اپنے ایمان پر قائم رکھا ہے مجھ سے مغرب کی قطعی تقلید کبھی نہ ہوگی جیسے مجھ سے مشرق کی غلامی بھی نہ کی جائیگی + خدا کرے ہم ہندوستانی عورتیں آزادی سے چلیں پھریں آزادی سے بولیں آزادی سے رہیں مگر خدا نہ کرے کہ ہمارے دماغ میں یہ خبط سمائے کہ بزرگوں کا ادب ہمارے دل سے اُٹھ جائے محض اس لئے کہ وہ غریب بزرگ مردوں کی جنس سے ہیں۔ ہم عُریاں لباس متحرک جسم رنگین جام و صراحی کے لئے للچانے لگیں۔ ہر شام کو کلب میں جُوا۔ ہر رات کو ناچ گھر میں رقص اور ہر کھانے پر پینے کے لئے شراب گرما گرم ہو۔ ناز و ادا ہماری گفتگو کو زیر و زبر کریں۔ ہم تبھی خوش ہوں کہ کوئی مرد ہمارے حسنِ لباس۔ حسنِ خرام یا حسنِ رُخ د

زلف کی تعریف کرے۔ خدا کرے ہندوستان کی سوسائٹی ان مخربات سے پاک و صاف رہے + خدا کرے
ہم باہر نکل کر اپنی قومی و ملّی ترقی اور انسانی تہذیب و تمدن کی حصہ دار بنیں لیکن یہ نہ ہو کہ جبتک ہفتے میں دو بار
تھیٹر اور مہینے میں دس دفعہ مغربی دعوتیں نہ ہوں دنیا میں ہمارا جی ہی نہ لگے۔ بیرونی زندگی میں اُسکی معاشرت
میں اُس کی سیاست میں ہم حصہ لیں لیکن اتنا کہ گھربار کی مصروفیتوں سے بے تعلق نہ ہو جائیں اور قرابت داریوں اور
عزیزانہ محبتوں سے بے اعتنائی نہ برتنے لگیں + میں چاہتی ہوں کہ مشرقی زندگی کے گھر کی ہمدردی و محبت
معاشرتی دُنیا کی فضا پر چھا جائے جس سے انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایک خوشگوار امتزاج پیدا ہو اور
دُنیا مردوں عورتوں کے لئے اک جنت بن جائے + خورشید پر میرا زور نہیں۔ نہ یوں ہو کہ وہ مجھے مجبور کرے
خدا کرے ہم دونوں کی زندگی ہمخیالی کے سانچے میں ڈھل جائے لیکن اگر خورشید کو یہی منظور ہے کہ وہ مغربی
مخربات میں حصے لے خواہ اعتدال ہی کے ساتھ تو میں تو بالکل چپ سادھ لونگی + میری تمنا ہے کہ مغربی بغاوت
کا جوش میرے دل میں نہ ہو لیکن ادھر مشرقی خودداری مجھے راہِ راست سے نہ ٹلنے دے + میرا شوہر بڑا
بھٹکے لیکن اسکے بھٹکنے سے میں نہ بہک جاؤنگی۔ نہ اُسکی مغربی افراط پر میں مشرقی تفریط کی پھر سے مشتاق
ہونے لگی ہوں + پیارے خورشید! ایسا نہ کر دکہ میں مایوس ہو جاؤں۔ تمہاری خوشی میرے سر آنکھوں پر
لیکن پیارے یہ بیرونی آزادیاں ہماری باہمی خوشیوں کے لئے جو تمہیں اب بھی دل سے پیاری ہیں۔
زہر قاتل ہیں + خدایا ہمیں توفیق دے کہ ہم نیک راہ پر چلیں اور ہماری محبتوں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ +

۴

خورشید قابل نوجوان تھا ہندوستانیوں سے انگریزوں سے اُس کا میل جول تھا۔ اپنے کام
میں اُسے مہارت تھی۔ اور بیرسٹر تو آٹھ آٹھ دس دس برس سے ابھی دلالی کے سہارے گذارہ کرتے
تھے لیکن یہ اچھی خاصی ایمانداری کے ساتھ اڑھائی تین ہی برس میں ہوشیار بیرسٹروں میں شمار ہونے
لگا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ اُس نے سیاسی زندگی میں بھی قدم رکھا اور لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر منتخب
ہو کر انڈیپنڈنٹ (آزاد خیال) جماعت میں شامل ہوا + اسمبلی میں اُس نے چند عمدہ تقریریں کیں اور
ان کے دوران میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کے سیاسی جھگڑے اب بھی ایک حد تک
انگریزوں ہندوستانیوں کے مابین اچھے تعلقات قائم کرنے سے کم ہو سکتے ہیں۔ اُس نے عدم تعاون
کی مخالفت کی لیکن یہ کہا کہ یہ تحریک نتیجہ ہے انگریزوں کی شہنشاہیت اور تکبر و نخوت کا + ہندوستانیوں

کا نصب العین ہندوستان کی آزادی ہونا چاہیئے لیکن موجودہ حالات میں ہندوستان کا انگلستان سے قطعی بے تعلق ہو جانا عملی سیاست کے بس کی بات نہیں۔ لہذا ہندوستان کے لئے بہتر یہی ہے کہ انگلستان کی سلطنت کے اندر رہ کر زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے اور انگلستان کا اخلاقی فرض ہے کہ سیاسی منتہا کے مطابق ہندوستان کو خود اختیاری حکومت کی شاہ راہ پر لگا کر چند برس میں اندرونی معاملات میں اُسے قطعی آزاد کر دے اور خارجی تعلقات میں دُنیا کی مجلس میں اُس کا رہبر بنے۔ انگلستان نے جس طرح اور جن جن صعوبتوں سے اپنے بادشاہوں سے آزادی حاصل کی اُسی طرح اُسے اب اپنے محکوم علاقوں کو خود مختاری کی الف بے تے سکھانی چاہیئے۔ وہ بعض سوراجیوں کا مدّاح تھا کیونکہ انہوں نے ملک کی راہ میں اپنی جان و مال تک کو قربان کرنیکا تہیہ کر لیا تھا اور بعض نے عملی طور پر اپنی زندگی کو اپنے کھدر کے لباس کا ہم شکل و ہم نوا بنا لیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی قوتِ اخلاق اور ایثارِ نفس کا وہ قائل تھا لیکن اُنہیں "سیاسی سنیاسی" پکارا کرتا تھا اور کہتا تھا بہتر ہوتا اگر وہ ہندوستان کے لئے اک نئے مذہب کی بنیاد ڈالتے اور بدھ یا نانک کے قدم بقدم چل کر اک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتے۔ خورشید کو سیاسی زندگی سے اک خاص اُنس ہو گیا + وہ اسمبلی کے کام کے دنوں میں خوش نظر آتا تھا۔ پٹیل کی آزاد ڈاڑھی رنگا چاریہ کا ٹیکہ رنگا آئر کے کھلے بال جناح کا منحنی چہرہ گویا اُس کے مرقعِ دل کی تصویریں تھیں۔ جہاں مسلمانوں کے خاص حقوق کا معاملہ درپیش ہوتا تھا وہاں وہ جناح کا پیرو تھا غرض خورشید ہندی سیاست میں ایک قوم پرست تھا لیکن معاشرت کی طرح سیاست میں بھی اُس کا طریقِ عمل مغربی وضع کی تقلید تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستانیوں کی جُملہ کمزوریوں کا مجرب نسخہ مغرب والوں کی قوت و نظام کا ہندوستان میں رائج کرنا ہے وہ کہتا تھا مغرب کے علم و فن سیکھو مغرب کی تعلیم مغرب کی معاشرت اختیار کرو تو تم مغرب کے مقابلے میں کھڑے ہو سکو گے + چند اراکینِ اسمبلی سے اُس نے خاص تعلقات پیدا کئے اُن میں علاوہ آزاد خیالوں کے ایک پارسی سوراجی بھی تھا۔ جس کا نام فیروز شاہ تھا + فیروز شاہ دراصل ایک آزاد خیال آدمی تھا لیکن پنڈت موتی لال کے اثر سے سوراجیوں میں شمار ہوتا تھا اور خورشید اُسے ہمیشہ آزاد سوراجی کہا کرتا تھا۔ فیروز بمبئی کا ایک پارسی لکھ پتی تاجر تھا اور شوقینی و وضعداری میں کسی طرح ہمارے دوست سے کم نہ تھا۔ لہذا دونوں میں ہمخیالی کی بنا پر دوستی پیدا ہو گئی + جب کبھی فیروز دہلی آیا کرتا تھا تو اکثر دو چار روز خورشید کے پاس قیام کیا

کرتا تھا۔

۵

دو برس یونہی گذر گئے۔ سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ خورشید نے معاشرتی میدان میں بھی اپنے خیال کے مطابق قدم بڑھایا۔ دہلی میں قیام کے پہلے ہی چند ماہ میں خورشید و قمر کو ایک دوسرے کے خیالات میل جول کے متعلق معلوم ہو گئے تھے ایک حد تک بیوی شوہر پر ایک دوسرے کا جداگانہ طرزِ عمل ظاہر ہو گیا تھا۔ یہ تفاوت بتدریج بڑھتا گیا۔ قمر نے کچھ اتنا پیچھے کو قدم نہ ہٹایا لیکن خورشید کا قدم روز بروز آگے کو بڑھتا گیا۔ پہلے چھ ماہ میں اُن کی چند گفتگوئیں بلکہ کہنا چاہیئے کہ بحثیں ہُوئیں لیکن ایک دوسرے سے اُن کا اختلاف بڑھتا ہی گیا۔ بعض دفعہ وہ الگ الگ سوچتے تھے کہ آخر ہمارا نقطۂ نگاہ اک دوسرے سے کچھ اتنا مختلف نہیں۔ کبھی کبھی قمر نے یہ بھی خیال کیا کہ شوہر کی خوشنودی کے لئے اُسے شوہر کی کوئی نہ کوئی بات مان لینی چاہیئے لیکن اُس کا دل ایسی بات کرتے کرتے یوں جھجک جاتا گویا آگے کوئی کُنواں ہے۔ اُس نے یہ ضرور کیا کہ اَور باتوں میں خورشید کی خاطر مدارات میں پہلے سے زیادہ کوشش اور پہلے سے زیادہ انہماک دکھایا اور اشاروں میں ظاہر کیا کہ خورشید کی مغربی پسند میں کچھ تو کمی ہو مگر ایسا نہ ہونا تھا نہ ہُوا۔ مغائرت دونوں کے درمیان بڑھتی گئی۔ خورشید سمجھا کہ قمر کے جی میں حسد کا اثر ہے قمر کو شک گذرا کہ خورشید کے دل میں وہ محبت نہیں رہی۔ آہستہ آہستہ باہر کے میل جول میں ایسا ہونے لگا کہ خورشید بعض دفعہ قمر کے ساتھ بعض دفعہ الگ اکیلا ہی شریک ہوتا۔ آئے دن کے بلاوے قمر کو ذرا تنگ کرتے یا کہیں مرد کے ساتھ بازو در بازو چل کر کھانے کے کمرے میں جانا ہوتا تو قمر کوئی بہانا بنا لیتی یا خورشید سے اجازت لے لیتی کہ مجھے معاف کیجئے۔ خورشید تیز مزاج نہ تھا لیکن شوقین تھا اور اپنی دُھن کا پکا۔ روز بروز انگریزیت کا دلدادہ ہوتا گیا۔ بندشوں کا موقوف کرنا آزادی سے لُطف اُٹھانا آسان ہے۔ کہیں ذرا سی پی لی۔ جی سے کہا کہ میں شرابی تو ہونے لگا نہیں۔ کبھی کبھی برج بھی کھیل لیا یہ سمجھ کر کے اُسے عقل کے نکمے ہی جُوا کہیں گے۔ بازو در بازو بھی چلے گئے کہ سب ایسا کرنیوالے دل لگی کے ارادے سے یہ رسم تھوڑا ہی ادا کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ اثر اُس پر اس بات کا ہُوا کہ بیسیوں انگریز جو عادتاً مدتوں سے یہ سب کچھ کرتے آئے ہیں نہایت مستقل مزاج نیک طینت اور شریف طبع ہیں۔ اور اُن میں سے بعضوں کی سیرت اِس قدر زبردست اور متانت پسند ہوتی ہے کہ اُنہیں عیش و عشرت کا شکار سمجھ لینا محض اپنی نادانی اور کوتاہ نظری کا ثبوت دینا ہے۔ تو ہندوستانیوں میں جو شخص یہ باتیں کرے ضرور نہیں

کہ وہ نیک چلن نہ ہو۔ ضرور نہیں کہ اُس کے دل میں بُرائی ہی ہو ضرور نہیں کہ وہ بدمست یا زن پرست ہی ہو اور اُس کی زندگی خراب و خستہ حال ہی ہو جائے + غرض تھوڑے عرصے کے بعد خورشید پکا مغربی بنتا گیا اور قمر کی مخالفت یا بے اعتنائی کو محض لاعلمی اور بعض وقت معصوم کم فہمی پر محمول کیا +

ایک مرتبہ اُسے لنچ پر مدعو کیا گیا تو وہاں اُسی شیریں جمشید جی سے ملاقات ہُوئی جس کے تمدن یافتہ حسن نے دو برس ہُوئے خورشید پر عارضی قابو پایا تھا۔ وہ دن گذر گئے۔ اسکے بعد سینکڑوں خاتونوں سے ملنا ہُوا کبھی قمر کی مصاحبت میں کبھی الگ۔ اُس کی زندگی بڑی حد تک جدید زندگی بن گئی تھی لیکن ابھی رقص کی نوبت نہ آئی تھی کہ شیریں سے دوبارہ ملنا ہُوا + ہم نہ مانیں گے کہ خورشید سے بلند حوصلہ مضبوط دل مرد کی نیت میں کسی قسم کا فرق آیا لیکن یہ اس کو کیا کریں کہ بہت سے متمدن مرد بعض مہذب عورتوں کی صحبت میں رہ کر بعض باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو اگرچہ تردامنی پر مبنی نہیں ہوتیں لیکن جن کا نہ ہونا ہونے سے بہتر ہے + شیریں سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک موقع پر اُس نے خورشید کو ہنسی ہنسی میں سہی لیکن رقصانہ حرکتیں سیکھنے کی ترغیب دی اور فن کے لحاظ سے اُن پر توجہ کرنے پر بھی مجبور کر دیا + سُنا ہے کہ آج کل کی شائستگی میں بسا اوقات بعض ایسی باتوں پر جو مشرقی قدامت کے نقطۂ نظر سے نہایت مخرب اخلاق ہیں مغربی فن پرست بلحاظ فن نہایت سرد مزاجی اور نیک نیتی سے نظر دوڑاتا ہے اور کسی کے چیں بجبیں ہونے پر اُس کے ہُنر شناس کہہ اُٹھتے ہیں کہ نکتہ چیں کے دماغ میں کیڑے پڑ گئے ہیں اور وہ حقیقت پر نظر نہیں رکھتا + اس پر طرہ یہ کہ صحبت اور انبوہ کا طرزِ عمل بلا کا اثر رکھتا ہے "پتھر کی چٹانیں جن پر سمندر کی لہریں صدیوں ٹکراتی رہیں گھُل گھُل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں کہاں انسانِ ضعیف دل اسکے لئے چند برس کی اچھی بُری صحبت کافی ہے کہ اُسے قطعی طور پر اَور کا اَور بنا دے +

خورشید و شیریں کی فن پرستیاں مستقبل میں کیا رنگ لائیں گی ؟ کون کہہ سکتا تھا کہ اس سے خورشید و قمر کے تعلقات اور محبت پر کیا اثر پڑیگا کم ازکم بچاری قمر کے لئے کیا قیامت برپا ہو گی ؟

ایک روز اُس کے سیاسی دوست فیروز شاہ نے اُسے کہا آؤ بھئی آئندہ اتوار کا دن ہمارے ساتھ باہر گذار و لیکن خورشید نے جواب دیا اُس روز مجھے ایک قدیمی دوست نے چائے پر بلایا ہے وہاں انکار کرنا محال ہے۔ کیا کروں ؟ + بات یہ تھی کہ شیریں جمشید جی نے خورشید کو قطب مینار کے قہوہ خانے میں چائے پر مدعو کیا تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ اس کا کسی کو پتہ چل جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید مجھے اکیلا ہی بُلایا ہو اس لئے پہلے

تو گریز کرنا چاہتا تھا لیکن جب شیریں نے شکایت کی اور اصرار کیا کہ آپ مجھ سے اتنا ہی ڈرتے ہیں تو قمر کو اپنے ہمراہ لے آئیے تو بچارا خاموش ہوگیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ خورشید کو کسی خاتون سے تنہا ملنے کا سوال درپیش ہوا ہو ایک طرف ابھی یہ خیال دل میں موجود تھا کہ یہ اک نامناسب بات ہے دوسری طرف معاشرتی زندگی کی اُلجھن تھی اور معلوم نہ ہوتا تھا اُس کو کس طرح سُلجھایا جائے کہ آدابِ مجلس میں بھی فرق نہ آنے پائے +

۶

خورشید اتوار کو موعودہ وقت سے دو گھنٹے پہلے اپنے گھر سے چلا۔ بیوی سے کہا ایک دوست سے ملاقات کا وعدہ ہے چائے وہیں پیوں گا۔ اس دوست کی حقیقت نہ اُس کے رفیق سیاسی کو معلوم تھی نہ اُسکے رفیقِ زندگی کو۔ اس قسم کے معاشرتی جھوٹ ہماری متمدن مشرقی و مغربی زندگی میں اکثر لوگ بولے جاتے ہیں۔ یہ کچھ بچارے خورشید ہی پر منحصر نہیں۔ البتہ بدقسمتی سے بعض جھوٹ اپنے بولنے والوں پر زحمت بن کر برستے ہیں جب کہ اور جھوٹ بولنے والے اکثر اپنے سفید جھوٹ سے بھی سُرخ رُو ہو جاتے ہیں +

خورشید کو گھر سے نکلے دس ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مسٹر اور مسز واس اُسکے گھر پہنچے۔ یہ معلوم کرکے کہ صرف قمر وہاں موجود ہے مسز واس اُتریں اور خورشید سے کہا آج قطب مینار کے قہوہ خانے میں شیریں جمشید جی نے تم دونوں کو چائے پر بُلایا تھا۔ مسٹر خورشید کہاں ہیں اور تم کیوں وہاں نہیں گئیں ؟

یہ پہلا موقع تھا کہ خورشید قمر کو چھوڑ کر اس طرح ایک "مبہم دوست" کی دعوت میں شریک ہونے کو گیا ہو + قمر سے یہ تو نہ مانا جاتا تھا کہ خورشید ایک خاتون کی دعوت میں بغیر اسکے شریک ہونا پسند کرے لیکن مدت سے متمدن فن پرستی اور مہذب تفریحات کی یورش سے اُسکے نازک دل پر مایوسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں، وہ فراخدل تھی لیکن خودداری و محبت اُسے بے بس کئے دیتی تھیں اور اس بھول بھلیاں سے نکل سکنے کی اُسے کوئی راہ نہ سُوجھتی تھی + خورشید ہمیشہ اُسے جدید زندگی کی تمام فروعات میں شرکت کی دعوت دیتا تھا تو قمر کا شریک نہ ہونا اُسی کا قصور تھا۔ وہ سبھی جدید تفریحات کا مشتاق ضرور تھا لیکن قمر کو ہمیشہ یقین دلاتا تھا کہ اُسے ان میں کوئی اخلاقی سقم نظر نہیں آیا + وہ کبھی کبھی سوچتی تھی کہ اُس سے زیادہ خوش نصیب وہی چار دیواری کی عورتیں ہیں جنہیں وہ قیدی سمجھا کی ہے پھر کہتی نہیں! اعتدال بہترین طریقہ ہے۔ کبھی یہ بھی کہہ اُٹھتی میں نہ ادھر کی رہی نہ اُدھر کی پُرانے لوگ مجھ پر آوازے کستے ہیں نئے لوگ میری پھبتی اُڑاتے ہیں۔ پھر خاموش ہو رہتی کہ خدایا مجھے اس کشمکش سے رہائی دلا۔ تو ہی کوئی راہ نکال تُو ہی کوئی سبیل بتا جس سے یا خورشید راہ پر آجائے یا

میں گمراہ ہو جاؤں ۔

خورشید قطب پہنچا تو دُور ہی سے دیکھا کہ بجائے اکیلی شیریں کے وہاں اَور بھی چند اشخاص جمع ہیں ۔ اس سے اُسے گونہ اطمینان ہُوا لیکن اُسکے تشویش و تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے مجمع میں مسٹر اور مسز داس کو دیکھا اور مسٹر داس نے بآوازِ بلند کہا آیئے ہم آپ کے ہاں گئے تو دیکھا کہ مسز خورشید نے آپکی غیر حاضری نوٹ کر رکھی ہے ۔ اور وہ عرقِ شرم میں غرق ہو گیا جب اُس نے فیروز شاہ کو شیریں کے پاس بیٹھا دیکھا اور شیریں نے بڑھ کر کہا "آیئے مسٹر خورشید! کیا آپ میرے منگیتر مسٹر فیروز شاہ کو جانتے ہیں ؟ ؟

وہ اک روشن سہ پہر تھی لیکن خورشید پر کیسی گذری اس کا بیان سخت مشکل ہے !

سب نے مل کر چائے پی ———— خورشید پاگل سا ہو گیا تھا ———— آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہُوا کیں ———— ایک ایک لمحہ اُسے قیامت کی گھڑی معلوم ہوتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح زمین زلزلے سے پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے، اُس کی تمنا تھی کہ پَر ہوں تو وہ اُڑ کر اس معاشرتی دُنیا سے دُور دُور کسی تنہا بیابان میں جا بسیرا کرے !

اک رسمی سی چائے پی کر ایک لغو سا بہانہ بنا کر وہ وہاں سے رفوچکر ہُوا اور شام تک باقی چار گھنٹے اپنی موٹر میں اِدھر اُدھر کبھی تغلق آباد کبھی صفدر جنگ کبھی ہمایوں کے مقبرے کے آس پاس گھومتا رہا ۔ اُدھر موٹر کا انجن چھک چھک چل رہا تھا ۔ اِدھر اُس کے دماغ میں پریشانیوں نے اک طوفانِ بے تمیزی بپا کر رکھا تھا ۔ ہزاروں خیال دل میں آتے جاتے تھے ۔ کیا یہی ہے شائستہ زندگی ؟ کیا اسی اُدھیڑ بن کیا اسی گورکھ دھندے کا نام معاشرتِ حاضرہ ہے ؟ میں نے کوئی بُرائی نہیں کی میں نے ہزاروں خوشیوں کا تعاقب کیا ۔ تفریحوں سے اپنے دل و دماغ کو بھر لیا لیکن خدا گواہ ہے کہ مجھے اطمینان نہیں ملا سکون حاصل نہیں ہوا زندگی سے اتنی تسلی بھی نہیں ہُوئی جتنی اک ہلکی پھلکی چڑیا کو اپنے گھونسلے میں !

شام کو گھر پہنچا تو باہر باغیچے میں اندر گول کمرے میں بہتیرا ڈھونڈا لیکن قمر کو نہ پایا ۔ بے اختیار اپنے کمرے میں بستر پر اوندھے منہ لیٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے اور چلانے لگا "قمر میری قمر!" کمرے میں اندھیرا تھا در و دیوار سے اُداسی برس رہی تھی خاموشی نے اک قیامت بپا کر رکھی تھی ۔ خورشید اُس دن کے بعد جب وہ انگلستان جاتے وقت اپنی علیل والدہ سے رخصت ہوا آج تک کبھی اتنا ملول بھی نہ ہُوا تھا کہ اُسکی آنکھ میں خفیف سی نمی آئی ہو ۔ اُس کی زندگی خوشی کے لئے وقف تھی اُس نے زندگی کا نام ہی خوشی رکھا

تھا لیکن آج اُسے زندگی غم کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ رنج و محن کا اک بُت نظر آتی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ روئے جائے اور اُن تمام خوشیوں کو جو اُسے گذشتہ چھ برس کی نشاط انگیز زندگی میں حاصل ہُوئی تھیں اشکوں کے دریائے بیکنار میں ڈبوئے جائے ۔

یک لخت کمرے میں برقی روشنی ہُوئی اور کسی نے اُس کے کانپتے ہُوئے ہاتھوں کو تھام کر کہا:-

"خورشید! میرے بیکار دن تیری ہی کرنوں سے روشن ہیں"

خورشید نے اپنی باہیں قمر کے گلے میں ڈالدیں اور اُس کی ہچکی بندھ گئی جس کے معنی تھے:-

"قمر! میری تاریک راتیں تیری ہی چاندنی سے پُر نور رہیں گی!"

"باغبان"

راگنیاں

تو ہمیشہ میری راگنیوں کی ندی سے دُور دُور تنہا کھڑا رہتا ہے۔ میری راگنیوں کی لہریں تیرے پاؤں دھوتی ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ کیونکر اُن تک پُہنچوں ؟ میرا تیرے ساتھ کھیلنا دُور ہی کا کھیلنا ہے۔ یہ فرقت کا درد ہے جو میری بانسری میں گداز ہو کر میٹھا راگ بن جاتا ہے۔ میں اُس ساعت کا منتظر ہوں جب تیری کشتی میرے کنارے آ لگے اور تُو میری بانسری کو خود اپنے ہاتھوں میں لے لے ۔

محبت

محبت کے الفاظ محبت کے اعمال ہیں۔

محبت میں فرار ہی حقیقی فتح ہے۔

محبت کا سب سے بڑا معجزہ دل لگی کی بیخکنی ہے

مرد میں پہلے خواہش ہوتی ہے پھر محبت۔ عورت میں پہلے محبت پھر خواہش ۔

عقل مایوس ہو جائے لیکن محبت ناامید نہیں ہوتی ۔

(گلچیں)

زورقِ ماہتاب

ہُوا ہے مہر ابھی نہاں

ابھی شفق ہے ضَوفشاں عجیب یہ بھی ہے سماں
فروغِ لالہ زار ہے بہار ہی بہار ہے سکوتِ شام میں کوئی نگار جلوہ بار ہے

کھڑے ہیں سرو صف بہ صف

ہجومِ گُل ہے ہر طرف کہ ہیں شہید سر بہ کف
بچھا ہے سبزہ سو بہ سو یہ کس کا انتظار ہے کہ فرش مستِ رنگ ہے تو عرش میگسار ہے

افق کا سینہ چیر کر

ہُوا ہے نور جلوہ گر جہاں تہاں، اِدھر اُدھر
یہ چشمہ رُک سکا نہ جب تو یک بیک اُبل پڑا افق سے نُورِ ماہ کا برنگِ موج اُچھل پڑا

یہ نُور کا وفُور ہے

کہ ذرّہ ذرّہ طُور ہے فروغِ سیلِ نُور ہے
یہ سَیل اپنے ساتھ ہی مجھے بہا کے لیگیا خبر نہیں کہاں کہاں مجھے اُٹھا کے لیگیا؟

حامد علی خاں

ادبیات

رات کی خاموشی میں۔

گھڑیال نے ٹن ٹن ابھی دو بجائے ہیں، شمع دان میں شمع اپنا آخری دم توڑ رہی ہے۔ نیند کے خمار میں بہرے والا دُنیا و مافیہا سے بےخبر ہو رہا ہے۔ محنت کش اور خوشحال لوگ محو آرام ہیں۔ "غور و فکر" "گناہ و جُرم" "عیش و عشرت" اور "یاس و نا امیدی" کے سوا سب سوتے ہیں۔ بادہ خوار اپنے آتشیں جام کو ایک دفعہ پھر بھر رہا ہے، راہزن آدھی رات کے گشت کو نکل رہا ہے اور خودکشی کرنے والا خدا کی دی ہوئی زندگی کے خلاف اپنا مجرمانہ ہاتھ بڑھایا ہی چاہتا ہے۔

میں آج کی رات اگلے وقتوں کی تصانیف کی اوراق شماری یا موجودہ مصنفین کے کارناموں کے ملاحظہ میں ضائع نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس سنسان راستے کی طرف قدم بڑھانا چاہتا ہوں جہاں ابھی ابھی "خود پرستی" اپنی تمام نیرنگ کاریوں کے ساتھ جیتی جاگتی نظر آ رہی تھی جہاں ابھی ابھی اُسی کا جلوہ نظر آتا تھا، لیکن اب اُس نٹ کھٹ بچے کی طرح جسے اُس کی حد سے بڑھی ہوئی شوخیوں نے خود ہی تھپک کر سُلا دیا ہو بالکل خاموش نظر آتی ہے۔

ہر طرف ایک سکوت افزا تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ بجھتے ہوئے چراغ سے زرد رنگ کی شعاعیں نکل رہی ہیں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہے، صرف گھڑی کی ٹِک ٹِک سُنائی دے رہی ہے یا کبھی کبھی کسی دُور افتادہ گوشہ سے کُتے کے بھونکنے کی صدا آ جاتی ہے۔ انسان کے طغیان و غرور کے تمام ہنگامے سرد ہو چکے ہیں۔ یہ گھڑی کس قدر عبرت آموز ہے؟ توبہ! انسان کی خود پرستی کا قصر بھی کس قدر کھوکھلی بُنیادوں پر کھڑا ہے؟

ایک وقت آئیگا کہ یہ عارضی ویرانی مستقل صورت اختیار کریگی۔ یہ شہر اپنی آبادی کی طرح نظروں سے اوجھل ہوگا اور اس جگہ ایک لق و دق صحرا نظر آئیگا۔

کتنے ہی شہر جو عظمتِ شان میں اسی کے ہم پلہ ہونگے اس دُنیا میں اپنے وقار کا نقارہ بجا چکے ہیں، اُن کی کامرانیاں بھی ایسی ہی عظیم الشان ہونگی، ان کی مسرتیں بھی ایسی ہی سچی اور غیر محدود ہونگی، اور

اُنہیں بھی اپنی کم نگاہی نے ابدی زندگی کا فریب ضرور دیا ہوگا۔لیکن بعد کی نسلوں کو اُن میں سے بعض کے ٹھکانے کا سراغ لگانے میں بھی دقّت ہوتی ہے سیّاح بھرے ہُوئے دل کے ساتھ دوسروں کی بربادیوں کے ہیبت زا نظارے دیکھتا ہے اُس کا تجربہ وسیع ہوتا ہے اور اُس پر دُنیا کے ساز و سامان کی بے ثباتی ایک روشن حقیقت بن کر ظاہر ہوجاتی ہے ؛

ہاں! اور وہ پُکار اُٹھتا ہے کہ "یہاں اُن کا سر بفلک قلعہ کھڑا تھا، لیکن اب اُس جگہ پر گھاس اُگ رہی ہے۔ وہاں اُنکی حکومت کے دفاتر تھے، لیکن اب وہیں مختلف قسم کے خوفناک سانپوں اور اژدہوں کے مسکن ہیں، اُن کی عبادت گاہیں، اور اُنکے دار العشرت اب صرف خاک کے چند بے معنی ڈھیر رہ گئے ہیں۔وہ کیوں تباہ ہُوئے؟ اس لئے کہ حرص اور نفس پروری سے انکی ہستی کی بنیادیں کمزور ہوگئیں سلطنت کی داد و دہش عیش و عشرت کے حصول کے لئے وقف ہوگئی، اور قوم کے وہ فرزند جو اُسکے لئے مفید ثابت ہو سکتے تھے، اس سے محروم رہے ؛

اُنکے مال و دولت نے اُنکی شوکت و شان نے ایسے حملہ آوروں کو دعوت دی، جنھوں نے ایک آدھ دفعہ کی ناکامی کے باوجود استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور بالآخر فریق ثانی کو تباہ و برباد اور بے نام و نشان کر گئے"

اب ان بازاروں میں جہاں ابھی ابھی ایک بے پناہ ہجوم نظر آتا تھا۔ بمشکل کوئی آدمی دکھائی دیتا ہے، اور وہ بھی اب اُس بھیس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جس میں دن کے وقت وہ اپنی خستہ حالیوں یا سیاہ کاریوں کو چھپاتا ہے ؛

لیکن وہ لوگ کون ہیں جنھوں نے گلی کوچوں کو اپنا شبستاں بناکر تھوڑی دیر کے لئے اُمرا کے دروازوں پر پریشاں حال پھرنے سے نجات پائی ہے؟ یہ لوگ مسافر ہیں، بے خانماں ہیں۔یا یتیم ہیں، اُن کی حالت اس قدر نازک ہوچکی ہے کہ انہیں کسی سے مدد کی توقع باقی نہیں رہی اور اُن کی مُصیبتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ان پر رحم کھانا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے اُن کا حال دیکھ کر رحم کی بجائے دل پر ایک ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔بعض کے پاس تن ڈھکنے کے لئے چیتھڑے تک موجود نہیں اور بعض کا جسم بیماریوں سے گھُل گھُل کر بالکل منحنی سا رہ گیا ہے۔ دنیا نے انہیں "عاق" کردیا ہے لوگ اُن کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے ہیں، عریانی اور فاقہ مستی کے سوا کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں، یہ غریب عورتیں جو سردی سے

ٹھٹھر رہی ہیں، کسی زمانہ میں خوشحال تھیں، لیکن اب قسمت نے انہیں جواب دیدیا ہے کہ زمانے کی سختیاں سہا کریں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض اب انہیں بے وفاؤں کے دروازہ پر پڑی ہوں جنہوں نے اُن کو فریب میں مبتلا کیا اور اب وہ ایسے لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا کرتی ہوں جن کے دل احساس سے خالی ہیں، یا ایسے اوباشوں سے مدد کی طلبگار ہوتی ہوں، جو بجز درشت کلامی کے اور کچھ نہیں جانتے ؛

آہ! مجھے انسان پیدا کرکے یہ خستہ حال لوگ کیوں دکھائے گئے، جن کی مصیبتوں کا علاج میرے بس کا نہیں ؟ تم بے خانماں ہو، قسمت کے ستائے ہُوئے ہو لیکن دنیا تمہیں فقط ملامت کرتی ہے، تمہارے دکھوں کا کوئی علاج نہیں کرتی۔ بڑے لوگوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ مصیبت، امرا کی موہوم سے موہوم تکلیف پر ہماری ہمدردی کا جذبہ برانگیختہ کرنے کے لئے فصاحت وبلاغت کے دریا بہائے جاتے ہیں لیکن غربا روتے ہیں اور کوئی نہیں سنتا۔ اُن پر مکروہ ترین ظلم وستم روا رکھے جاتے ہیں اور وہ خاموشی سے سہتے ہیں، کیونکہ ہر وہ قانون جو دوسروں کی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے اُن کے لئے ایک سخت دشمن سے کم ثابت نہیں ہوتا ؛

میرا یہ دل اس قدر احساس لے کر کیوں پیدا ہوا تھا ؟ پھر کیوں میری قسمت نے میرے دل کا ساتھ نہ دیا ؟

آہ! جب کوئی شخص کسی کی مدد کرنی چاہے لیکن اس پر قادر نہ ہو تو اُس کی حالت مدد چاہنے والے سے بھی زیادہ قابلِ رحم ہو جاتی ہے ؛

(ترجمہ) ——— حامد علی خاں

ذاتی کشش

میرا خیال ہے کہ زندگی کے اُن تمام پُراسرار معمّوں میں سے جنہوں نے انسان کی عقل کو عاجز کر رکھا ہے، ذاتی کشش کا معمّا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں بعض لوگوں کو ایک دوسرے سے کشش ہوتی ہے، اور پھر کیوں وہ بعض ایسے لوگوں کو ایک بے سبب ناپسندیدگی کے باعث بالکل ناقابلِ توجہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں جن کی نسبت اُن کے دوستوں کو یقین ہوتا ہے کہ وہ ضرور اُنہیں پسند کرینگے ؟ بعض لوگوں سے ہمیں کیوں ایک خاص عرصہ تک لگاؤ رہتا ہے اور بعد میں

ہم اُن سے کیوں کھنچنے لگتے ہیں؟ ہاں اور پھر کیوں بعض مقامات بھی ہمارا دل موہ لیتے ہیں؟ حالانکہ بعض دوسرے مقامات سے ہمیں اپنا کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ یہ عجیب وغریب باتیں ہیں۔ اور ان پر ایک راز کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن ان کی صداقت سوچنے والوں کے لئے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ غالباً ہمارے لئے اپنے اُس اثر کا اندازہ کرنا دشوار ہے جو ہم نادانستہ دوسروں پر ڈالتے ہیں۔ بلکہ عموماً ہم خود بھی دوسروں کی شخصیت سے بے خبری ہی میں متاثر ہوتے ہیں یہ اثرات کس قدر نازک ہیں؟ اور انکے لئے کس قدر لطیف احساس کی ضرورت ہے

زندگی کے ہر لمحہ میں لوگ دانستہ ونادانستہ دوسروں کو اپنی ذات سے متاثر کرتے رہتے ہیں۔ اور خود بھی مختلف مردوں یا عورتوں سے کتابوں تصویروں یا صنعت کے نمونوں سے' بلکہ اپنے حوالیات تک سے ہر وقت متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پراسرار حقیقت کا روشن ترین پہلو محبت میں نظر آتا ہے۔ اور اگرچہ دوستی میں بھی اس کی پوری جھلک دکھائی دے جاتی ہے لیکن یہاں اس کی صورت ذرا کم ہنگامہ خیز ہوتی ہے۔ میں نے اکثر والہانِ محبّت کو بعض ایسی عورتوں کا ذکر نہایت کیف انگیز انداز میں کرتے دیکھا ہے جو دوسرے ہر شخص کے نزدیک نہ صرف کودن بلکہ بالکل سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ اسی طرح میں نے بعض نہایت لطیف الاحساس اور پسندیدہ خصلت عورتوں میں ایسے مردوں کی محبت دیوانگی کی حد تک بڑھی ہوئی دیکھی ہے جو نہ صرف اجڈ بلکہ نہایت "عامیانہ مذاق" کے ہوتے ہیں۔ بعض مقامات میں قدم رکھتے ہی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ اور بعض دوسرے مقامات میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں قدم بڑھانے سے روک رہے ہیں یا ہماری آمد سے کامل طور پر بے اعتنا ہیں۔ سمندر کے کنارے ایک قصبہ ہے جسے ہر شخص خوبصورت سمجھتا ہے لیکن جب کبھی میں وہاں پہنچتا ہوں مجھ پر ایک ناقابلِ توجیہ دغیر خوش آئند اثر پڑتا ہے اور میں اُس سے نفرت کرنے لگتا ہوں حالانکہ بعض اور ایسی جگہیں ہیں، جو نہ تو اس قدر آراستہ ہیں اور نہ انہیں قبولِ عام کی سند ہی حاصل ہے لیکن اس کے باوجود مجھے وہاں اپنی تمام زندگی گزار دینے میں بھی تامل نہ ہوگا۔ لوگ اپنی "رغبت" اور "نفرت" کے اسباب کے متعلق دلائل پیش کرنے سے قاصر ہیں لیکن کوئی اُن کے وجود سے انکار نہیں کرسکتا۔ مگر پھر بھی اُن کا ایک نہ ایک سبب تو ضرور ہونا چاہیئے۔ تو آخر وہ کیا ہے؟ یا

اگر ہمیں اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کے انسداد کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟

افسوس! مجھے یہ معلوم نہیں۔

کاش ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ محبت دل میں کیوں پیدا ہوتی ہے! اور بالخصوص اگر یہ معلوم ہوتا کہ محبت دل سے نکل کیوں جاتی ہے تو ہماری روح کو کتنا سکون حاصل ہو جاتا۔ اکیس برس کی عمر میں جس لڑکی کی ہم پرستش کرتے ہیں بعض اوقات تیس سال کی عمر میں اس کی صحبت ہمارے لئے کتنی ناگوار ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہمیں اپنے ایسے دوستوں میں کوئی خوبی باقی نظر نہیں آتی۔ جن سے ہمکلام ہونے اور اپنے دل سے باتیں کرنے میں کچھ عرصہ قبل ہم کوئی امتیاز نہ کرتے تھے۔ پھر کیا اس زندگی میں اس سے زیادہ افسوسناک کوئی حقیقت اور بھی ہے کہ دو نیک نیت انسان محبت کی ایک افسردہ چنگاری کو ہوا دینے کی بے سود کوشش کر رہے ہوں؟ ہم اس شعلہ کی افسردگی کے لئے جسے اُن دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ رکھ سکا کسی کو قابلِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہ شعلہ بجھ گیا، وہ ہنگامے سرد ہو گئے، اور انہیں جدائی کا احساس ہونے لگا۔ کوئی اُن پر رحم نہیں کرتا، بلکہ لوگ انہیں مجرم سمجھتے ہیں اور انہیں بے وفا اور بوالہوس کہتے ہیں، کیونکہ کسی کو قابلِ عفو ثابت کرنے کے لئے دلائل پیدا کرنے سے زیادہ آسان بات یہ ہے کہ اُسے بُرا بھلا کہہ لیا جائے میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ اگر شادی کے قانون کی بنیاد گول کمرہ کی موسیقی کے پیدا کئے ہو جذبہ انگیز خوابوں کی بجائے عملی آزمایش پر استوار کی جاتی تو رشتۂ ازدواج کو دو مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا پہلے تقریباً تین سال کی میعاد کے لئے ایک "قانونی شادی" ہوتی اور اس کے بعد اگر شوہر اور بی بی دونوں خواہش مند ہوتے تو "مذہبی شادی" سے اس کی تجدید کی جاتی۔ بصورت دیگر بی بی کے لئے یا اگر بچّے پیدا ہوئے ہوں تو اُنکے لئے بھی ایک معقول وظیفہ مقرر کرنے کے بعد یہ شادی خود بخود فسخ ہو جایا کرتی۔ اس طرح دو آدمی اُس صبر آزما مصیبت سے نجات پا سکتے، جو انہیں طبیعتوں کے اختلاف اور ایک دوسرے کو اپنی روح کی گہرائیوں سے قابلِ نفرت سمجھنے کے باوجود ساتھ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ تین سال کے اختتام پر اگر بی بی معاہدہ کی تجدید کی خواہشمند نہ رہتی تو اس کی وہی حیثیت سمجھی جاتی جو معاشرتی دنیا میں بیوہ کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس میعاد کے بعد شوہر اور بی بی ایک دوسرے کے بہی خواہ نہ رہتے اور اپنی اولاد کو ہر وہ سہولت جو اُنکے امکان میں ہوتی بہم پہنچانے میں ایک دوسرے کا ہاتھ نہ بٹاتے۔ میرے خیال میں یہ طریقہ موجودہ غیر مطبوع صورت سے کہیں زیادہ

اچھا ہوتا جس میں محض اس لئے دو خشمگیں اور جھلائی ہوئی بلبلوں کی طرح زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ کہ وہ جنون پرور ولولہ جو ایک خوشگوار رات کو دل میں پیدا ہوا تھا اُن کی تمناؤں کو پامال کرتا ہوا فنا ہوگیا ہے، میرے خیال میں طلاق کی مکروہ رسم سے ہر دوسری صورت زیادہ گوارا ہے۔ گناہ کا راستہ دکھانے میں کوئی چیز اتنی کامیاب نہیں ہوسکتی جتنی یہ بات کہ دو آدمیوں کو ایک غیر محدود عرصہ کے لئے نفرت اور ناموافقت کے رشتہ میں منسلک رہنے پر مجبور کردیا جائے۔ یقیناً ایک دن کوئی دوسرا طریق کار اختیار کیا جائیگا۔ لیکن اس دن نوجوانوں کی حق تلفیوں کے لئے دنیا پر بڑی بوڑھیوں کی حکومت نہ ہوگی۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ میری اس رائے کی مخالفت کے لئے بعض لوگ فوراً "مذہب" کو ایک آخری اور فیصلہ کن دلیل سمجھتے ہوئے میرے سر پر لا کھڑا کرینگے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بعض ایسے بزرگوار بھی ہیں جو ہر اس بات میں "مذہب" کو لا دخل کرتے ہیں جس سے بنی نوع انسان کی سود و بہبود کی کوئی بہتر صورت نکل سکے۔ لیکن اس سے فائدہ کیا؟ صرف یہی کہ اس سے ایک اور ویسی ہی پیچیدگی کا سامنا ہوجاتا ہے جو کسی بحث کے دوران میں غیر متعلق شخص بلا وجہ دخل دے کر پیدا کر دیا کرتے ہیں۔

(ترجمہ) حامد علی خاں

میں جانتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ کسی دن کے دھندلے خاتمے پر سورج مجھے اپنی آخری الوداع کہیگا۔ چرواہے بڑ کے درخت کے نیچے اپنی بانسری بجائینگے اور چوپائے دریا کے کنارے گھاٹیوں پر چرتے ہونگے جب کہ میرے دن تاریکیوں میں غائب ہوجائینگے!

یہ میری دعا ہے کہ رخصت سے پہلے میں جان لوں کہ زمین نے کیوں مجھے اپنی گود میں لیا تھا؟ کیوں اُسکی رات کے اندھیرے نے مجھ سے تاروں کی باتیں کیں اور اُسکے دن کی روشنی نے کیوں میرے خیالات کو پھول بنادیا؟

اے کاش! جانے سے پہلے میں اپنے آخری گیت کو اچھی طرح گنگنا لوں اور اُسکی موسیقی کو مکمل کرلوں اُس چراغ کو روشن کروں جس سے تیرا چہرہ دیکھ سکوں اور وہ ہار پرولوں جو تیرے سر کا تاج ہو!

(گلچیں)

درسِ امروز

موسم بہار کا ہے اور پھول بھی کھلے ہیں
آؤ چلو چمن کو یہ وقت ہے غنیمت
کچھ پھول جمع کرلو، موقع ہے آج اسکا
کیا جانئے کہ کل کو آجائے کیا مصیبت
کس سوچ میں ہو یارو، یہ وقت ہے غنیمت

کالی گھٹا فلک پر چھائی ہوئی ہے ہر سو
توبہ کا در بھی وا ہے اور بابِ میکدہ بھی
لبریز جام کرلو، قسمت ہے آج یاور
پیرِ مغاں بھی خوش ہے، رحمت بھی ہے خدا کی
جھک جاؤ آج دیکھو، یہ وقت ہے غنیمت

طاقت بھی ہے بدن میں، تقدیر بھی جواں ہے
حاصل ہے تمکو سب کچھ، کس بات کی کمی ہے
کچھ کام آج کرلو، یہ وقت کام کا ہے
کل کیا خبر کہ کیا ہو، دو روزہ زندگی ہے
ضائع کرو نہ اس کو، یہ وقت ہے غنیمت

(گلیم) ——— (ابو الفاضل راز چاندپوری)

نذرِ محبوب

ہو جائیں کبھی کاش! ترے زینتِ داماں
گلہائے وفا، دیدۂ گریاں میں کھلے ہیں
میں تیرے تصور کی نوازش کے تصدق
کیا پھول مرے گوشۂ زنداں میں کھلے ہیں
برباد نہ ہو جائیں کہیں، بادِ حوادث!
وہ گل کہ محبت کے گلستاں میں کھلے ہیں
وہ پھول جنہیں صبحِ وطن راس نہ آئی
کس حسن سے اب شامِ غریباں میں کھلے ہیں
تھے صحنِ گلستاں میں جو افسردہ و بے رنگ
وہ پھول، غضب دامنِ جاناں میں کھلے ہیں
ہے بادِ سموم ان کے لئے موجِ مسرت
یہ داغِ جگر کثرتِ حرماں میں کھلے ہیں
اے کاش! ترے حسن کے منظورِ نظر ہوں
کچھ پھول مرے گلشنِ ارماں میں کھلے ہیں
رہ جائے تہی ان سے نہ دامانِ ضیائی
یہ گل جو ترے لطفِ فراواں میں کھلے ہیں

بشیر ضیائی - کوہ مری

چشمِ بد دُور

فیشن میں رفعت یورپ کی غاصبانِ پرستش سے دس قدم آگے ہی ہے اور اسی لئے اسکے بالوں میں جرمن فلسفے کی پیچیدگیوں کی بجائے موجودہ پیرس کا اختصار ہے۔ طرفہ تر یہ امر ہے کہ گو میری طرح اسے بھی ابھی یورپ کی ہوا نہیں لگی مگر اسے ساڑھی، شلوار اور غرارے سے عار ہے نظرِ عنایت صرف فراکوں پر ہے اور فراک بھی ایسے جو رعب حسن سے سمٹ کر بصد ادب نثار زانو ہوں، آجکل کے رواج کے مطابق جبکہ فیشن مذہب ہے اور مذہب صرف ایک فیشن رفعت گویا مذہبی رنگ کی پوری نمائندہ ہے مگر باوجود اسکی اسقدر ثقاہت کے یہ کہنے کی جرأت کیجا سکتی ہے کہ اگر کفر، کے معنے اُنکار، کے ہیں تو رفعت دنیا بھر میں چوٹی کی کافر ہے اور بلا مبالغہ اپنے جیسی کفار ہستیوں میں اسکا مرتبہ وہی ہے جو پہاڑوں میں ہمالہ کا کیونکہ معمولی کافر تو خدا سے یا زر سے مُنکر ہوتے ہیں مگر یہ شریر علاوہ ان کفروں کے خود اپنے حُسن سے بھی منکر ہے۔ اکثر تو دھوکا ہو جاتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں کہ حُسن کس جانور کا نام ہے کیونکہ کئی موقعوں پر حسینوں کی موجودگی میں مجھ جیسی مجسم غلطی سے آلپٹی ہے صرف حُسن ہی تک اسکا انکار محدود نہیں بلکہ تہذیب کی کئی اور شاخوں سے بھی قطعی باغی ہے، سواری کا انکا ڈھنگ دیکھئے عام طور پر سواری کیلئے دُنیا بن ٹھن کر نکلتی ہے مگر رفعت کو جب سواری مدِنظر ہو تو اہتمام سے عمدہ فراک پھینکا جاتا ہے اور گھوڑا بضد وہاں بھگایا جاتا ہے جہاں کیچڑ یا بھوبھل ہو۔ اسی طرح توقع یہ ہوتی ہے کہ کم از کم کھانیکے موقع پر تو رفعت شعار مجلس کو نہ روندیگی مگر بارہا یہ ہوتا ہے کہ دیر سے آئیں اور نہایت بے پروائی سے کھائے پیئے بغیر انگڑائیاں لیتی ہوئی چلدیں، اور تو اور اگلے دن کا قصہ ہے کہ ایک آنریبل کے۔ سی۔ ایس۔ آئی محبت سے رفعت کو مخاطب کرنے لگے مگر وہ کچھ ایسی بے پروائی کے نشہ میں تھی کہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا اس کافرِ مطلق کی اور باتیں بھی قابل تذکرہ ہیں مگر انکے بیان کیلئے پھولوں سے زیادہ خوشرنگ الفاظ کی ضرورت ہے کیونکہ رفعت خود ابھی پھول ہے ٭

رفعت کی عمر صرف تین سال ہے، وہ دن آئیگا کہ بسم اللہ کو پچھلا لکھکر وہ فطرتی اور ازلی اسلام سے مُنہ موڑ کر رسمی اسلام کے حلقے میں داخل ہو جائیگی اور پھر وہ دن آئینگے کہ معلومات کے چمکدار آئینہ میں یہ منعمہ اس پُر از نعمت دنیا کے خوشنما رنگ دیکھیگی اور آئے دن اسی کیلئے گلہائے مسرت کھلینگے۔ کوئی بھی تعجب نہیں کہ وہ ایک معجز بیان شاعر بن کر ایوان شہرت میں صدر نشین بنے مگر کوئی آئندہ نظم اسکی اس نظم کی برابری نہ کر سکیگی جو اسکے ہلکے ہلکے پاؤں کے پیارے پیارے بوجھ سے (جب وہ میرے کندھوں پر جمناسٹک کرتی ہے) میرے دل میں تحریر ہوتی ہے ٭

-چشم بد دور-

عزیز

زمزمۂ عندلیب

کیفِ بہار

بہار اے دل! آگئی چمن میں سبزہ زار میں
یہ کوئلوں کی بولیاں!
یہ زمزموں کی مستیاں!
یہ عشق کی کہانیاں، چڑھاؤ اور اُتار ہیں   بہار، اے دل! آگئی چمن میں سبزہ زار میں
کنارِ جُو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں؟
وہ مور ناچنے لگے!
وہ مستِ نغمہ ہو گئے!
یہ نہر کی روانیاں، رَوانیوں میں شوخیاں   کنارِ جُو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں
پھر اے دلِ حزیں! نہ کیوں غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
جہاں تمام مست ہے
پئے ہُوئے خوشی کی مے
پھر اب بھی کیوں ہمیں یہ غم، یہ رنج، یہ ستم اُٹھائیں؟   اب آ کہ اے دلِ حزیں، غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
یہ زمزمہ طیور کا یہ نغمے جوئبار کے
چل، اور مستعار لائیں!
اُٹھو اور آج ہم بھی گائیں!
کہ ایک عمر ابھی پڑی ہے غم کی یاد کے لئے
ذرا سنبھل، دلِ حزیں! کہ ہیں یہ دن بہار کے



سروجنی نائڈو   (ترجمہ)   حامد علی خاں

موت اور زندگی

جو حال دیکھ کر مرا

کچھ اُس کو رحم آگیا

تو میرے سر پہ ہاتھ رکھ کے آج موت نے کہا

کہ پیاری بچی قید غم سے میں کروں تجھے رہا؟

تجھے نیا جہاں ملے، ترے نئے ظہور کو

کنول ہوں، اُن کی مستیاں ہوں، نغمۂ طیور ہو

یہ تتلیوں کی شوخیاں

یہ پھول اور اُنکی مستیاں

یہ قطرہ ہائے ابر، یہ ہوا اور اُس کی شورشیں!

سبھی یہ تیری رُوح کا مکان آخری نہیں؟"

کہا یہ میں نے موت سے "یہ رحم یہ کرم ترا

مرے لئے ہے وجہ ننگ و عار، آہ موت! کیا؟

عبث ہے میری زندگی؟

مری غرض نہیں کوئی؟

میں اپنی زندگی کی تلخیوں سے ہار جاؤں کیوں

ہنسی خوشی زمانہ کے ستم نہ میں اُٹھاؤں کیوں

ہو، تاکہ حاصل اپنی زندگی کا مُدعا مجھے

سخن سے، خدمتِ وطن سے مل چکے بقا مجھے



سروجنی نائڈو (ترجمہ) حامد علی خاں

محفل ادب

ہستئ بیتاب

(از علامۂ اقبال مدظلہ)

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو!
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا
زینتِ گلشن بھی ہے آرائشِ صحرا بھی ہے

ہمنشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز سے
اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے

عینِ شغلِ مے میں پیشانی تری ہے سجدہ ریز
کچھ ترے مشرب میں رنگِ مسلکِ مینا بھی ہے

مثلِ بوئے گل لباسِ رنگ سے عُریاں ہے تو
ہے تو حکمت آفریں لیکن تجھے سودا بھی ہے

جانبِ منزل رواں بے نقشِ پا مانندِ موج
اور پھر اُفتادہ مثلِ ساحلِ دریا بھی ہے

حُسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے
پھر عجب یہ ہے۔ کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنّن پر مدار
تو کبھی اک آستانہ پر جبیں فرسا بھی ہے

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب
اے تلوّن کیش تو مشہور ہے رُسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بیتابی کے صدقے، ہے عجب بیتاب تو

انگریزی زبان کا مشہور شاعر ملٹن اندھا تھا۔ اسکی تیسری بیوی نہایت حسین تھی، لیکن اسی قدر بدمزاج ایک مرتبہ لارڈ بکنگھم اس سے ملنے گئے تو ملٹن نے اپنی بیوی کی بڑی شکایت کی، لارڈ نے کہا کہ "تم اس کی شکایت کرتے ہو، حالانکہ وہ تو گلاب کا پھول ہے"

ملٹن نے جواب دیا کہ "ہاں گلاب کا پھول تو ہے لیکن اس حقیقت کو میں نے اسکے رنگ سے نہیں بلکہ اسکے کانٹوں سے پہچانا ہے"

سائبیریا کے شمال میں جہاں ہمیشہ برف قائم رہتا ہے، ایک پھول ایسا نظر آتا ہے جو سال میں صرف ایک مقررہ دن پر اُگتا ہے، اسکی تین پتیاں ہوتی ہیں اور اس کا قطر تین انچہ کے برابر ہوتا ہے، یہ پتیاں ایک ہی طرف اگتی ہیں اور اُن کا رخ شمال کی طرف ہوتا ہے اور درمیان سے ایسی نظر آتی ہیں جیسے برف کے بلوری ٹکڑوں سے ڈھکی ہوئی ہوں، جس وقت یہ پھول کھلتا ہے تو تارے کی طرح نظر آتا ہے، اس میں پانچ بیج ہوتے ہیں۔ بعض لوگ سٹروگراڈ میں ان بیجوں کو لے گئے اور برف سے بھرے ہوئے برتن میں انکو رکھا تو دوسرے سال اُسی مقررہ دن پر برف کے اندر سے درخت پیدا ہو گیا ٭

روس میں کھانا پکانے کا ایک ایسا ذریعہ یا آلہ ایجاد ہوا ہے جس سے بیک وقت ۵ ہزار آدمیوں کا کھانا پک سکتا ہے، اس ایجاد کا مقصود یہ ہے کہ عورتوں کا وقت کھانا پکانے میں ضائع نہ ہو، بلکہ وہ بھی آزادی سے مردوں کے دوش بدوش دنیا میں کام کر سکیں ٭

گرگٹ کے رنگ بدلنے کے متعلق جدید تحقیق یہ ہے کہ اسکی جلد کے نیچے بعض غدود ایسے ہیں جن سے ایک سیال شئے خارج ہوتی ہے اور اسکی وجہ سے اسکا رنگ بدلتا رہتا ہے، جب یہ سبز پتوں کے درمیان ہوتا ہے تو اس کا رنگ بھی سبز ہو جاتا ہے کیونکہ آنکھوں کے ذریعہ سے اس رنگ کا اثر اُس سیال شئے پر پڑتا ہے ٭

چنانچہ بعض گرگٹوں کی آنکھیں پھوڑ کر تجربہ کیا گیا تو معلوم ہُوا کہ انکا رنگ بدلنا بند ہو گیا ہے۔ اور وہ اپنے خاکستری رنگ پر بدستور قائم ہیں ٭ (نگار)

تلگو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہُوا ہے، اور اسکے مقدمہ میں پیغمبر اسلام علیہ السلام کی مختصر سیرت بھی دیگئی ہے، لیکن آپ جانتے ہیں یہ کارنامہ کس کا ہے؟ کسی تعلیمیافتہ مسلمان کا نہیں، کسی عام مسلمان کا نہیں، بلکہ ایک ہندو جدید تعلیمیافتہ کا، چیلوکری نرائن راؤ ایم اے، ال ٹی، لکچرار راج مندری کالج نے اس کام کو انجام دیا ہے، اور اس ترجمہ کی غرض و غایت حسب ذیل رکھی ہے:۔

تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ قرآن پاک اور گیتا کی تعلیم مختلف حیثیتوں سے باہم کس درجہ

مطابق ہے، اور اس لئے باہم ہند و مسلمانوں کا لڑنا کس قدر غلط ہے ؛

اس ترجمہ کا نام "قران شاستر"، یا قران شریف ہے، غالباً یہ ترجمہ براہِ راست عربی سے نہیں انگریزی سے لیا گیا ہے ؛
(معارف)

میری آنکھیں اور دل باہم برسر پیکار ہیں،
دل کا دعوےٰ ہے کہ تیری شبیہ اس پر کندہ ہے، لیکن آنکھیں کہتی ہیں کہ تو ان میں سمایا ہوا ہے! آنکھیں دل سے کہتی ہیں کہ اگر ہم اسے نہ دیکھیں تو تو کس طرح کیف اندوز ہو سکتا ہے؟ مگر دل کا جواب ہے کہ اگر میں خواہش نہ کروں تو تم کچھ نہیں دیکھ سکتیں!

اس جدل لطیف کا حکم خیالات کو بنایا گیا انہوں نے بہت سی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ

"دل اور آنکھیں، ہردو صداقت پر ہیں، اور کیف نظارہ میں دونوں کا برابر کا حصہ ہے،
آنکھوں کا حصہ ظاہری نمود ہے، اور دل کا حصہ روحانی تعلق!
شیکسپئیر
(قوس قزح)

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ہندوستان بھر میں اردو کے اچھے رسایل انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں اور پھر بھی اُن کی اشاعتیں اس قدر قلیل ہیں کہ وہ اپنے مصارف بھی پورے نہیں کر سکتے۔ برخلاف اسکے ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی رسائل کی اشاعتیں اس قدر کثیر ہیں کہ حیرت ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن زبانوں میں نوشت و خواند کرنے والے ہندوستانی ایک ایک دو دو رسائل ضرور خریدتے ہیں اور سب سے بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اردو زبان میں جو "ہندو رسایل" شائع ہوتے ہیں اُن کی اشاعتیں بھی اسلامی رسایل سے دوگنی اور سہ گنی ہیں۔ ان حقایق سے مسلمانوں کی علم و ادب اور زبان کی طرف سے بے توجہی کا اظہار ہوتا ہے ؛

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ علم و ادب اُن کی میراث ہے۔ علم و ادب سیاسیات سے بھی ضروری ہے اور کسی قوم کی بقا اور ترقی کے لئے علم و ادب کی سرپرستی لازمی ہے ؛

(نیرنگِ خیال)



"نورجہاں"

(ایک بلند پایۂ رسالہ عورتوں کیلئے)

اس نام سے جنوری آئندہ سے ایک نہایت بلند پایۂ رسالہ مستورات ہند کے لئے امرتسر سے جاری کیا جانیوالا ہے - جس کا مقصد عورتوں کی انتہائی روحانی - اخلاقی - مادی و علمی ترقی ہوگا جس میں علوم و فنون قدیم و جدید و تحریکات حاضرہ اور عالم کی عورتوں کے حالات ؛ مقالات ؛ غیرہ صاف اور روشن صوت میں پیش کئے جائینگے - اس رسالہ کی عنان ادارت ایک نامور اخبار نویس خاتون کے ہاتھ میں ہوگی - کاغذ اور کتابت وطباعت دیدہ زیب ہوگی - نومبر کے مہینہ میں ایک نمبر نمونہ کے طور پر کثیر تعداد میں شائع کر کے عرض وطول ہند میں مُفت تقسیم کیا جائیگا -

جُملہ خط وکتابت متعلقہ بنام **منیجر "رسالہ نورجہاں" - امرتسر ہونی چاہیئے** -

---

رسالہ زمانہ کانپور

رسالہ "زمانہ" اُردو کا بہترین باتصویر ماہواری رسالہ ہے جو منشی دیانراین صاحب بی اے کی ایڈیٹری مین عرصہ ۲۲ سال سے روزافزون ترقی کیساتھ نکل رہا ہے - زمانہ مین ملک کے نامور انشاپردازون اور اُردو کے مسلم الثبوت اساتذہ کے مختلف مباحث پر مفید اور قابل دید مضامین درج ہوتے ہین یہ رسالہ کسی خاص قوم یا فرقہ یا مذہب کا طرفدار نہین ہے بلکہ اسکو ملک کی عام بہبودی مذاق تعلیم کی ترقی اور معلومات کی توسیع منظور ہے یہی وجہ ہے کہ یہ نہایت کامیابی کیساتھ ۲۲ سال سے ابتک جاری ہے پانچ روپیہ منی آڈر بھیجکر سال بھر کیلئے خریدار بنجائے یا پہلا پرچہ وی پی طلب کیجئے -

پایونیر الٰہ آباد زمانہ نے ملک کے مشہور انشاپردازون اور شاعرون کی امداد حاصل کرلی ہے -

اودھ اخبار لکھنو اردو رسائل مین اسنے اپنے قابل قدر مضامین کے لحاظ سے بہت بڑی ترقی کی ہے -

ہندوستان لاہور "زمانہ" اُردو کے رسالون مین چوٹی کا رسالہ ہے

بھارت مترا کلکتہ زمانہ کے ہر نمبر مین غور سے پڑھنے کے لایق مضامین ہوتے ہین -

زمانہ کے اعلیٰ دلچسپ اور مفید مضامین کی چاردانگ ہند مین شہرت ہے - آپ اس اعلیٰ رسالہ کی خریداری شروع کیجئے

المشتہر منیجر زمانہ کانپور

قرآن مجید مترجم حضرت شیخ الہند مولنا محمود حسن

آجتک جسقدر ترجمے قرآن پاک کے ہوچکے ہیں یہ ترجمہ سب پر جملہ خوبیوں کے لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے تحت لفظی ہونیکے باوجود بامحاورہ اور سلیس ہے اور زبان ایسی شستہ اور صاف کہ جس کو معمولی لکھا پڑھا بھی بخوبی سمجھ سکے لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت اعلےٰ زمین حنائی مطبوعہ۔ زیر طبع ہے جو مکمل ہونے پر ملیگا۔ ہدیہ پیشگی مجلد ؎ غیر مجلد ؎ بعد طیاری مجلد ۱۵؎ غیر مجلد ؎
پارۂ الٓمٓ اسی ترجمہ کا سبزی مائل زمین میں علیحدہ بطور نمونہ مل سکتا ہے جس سے آپ کو پورے قرآن شریف کے لکھائی۔ چھپائی اور تقطیع کا صحیح علم ہوسکتا ہے فی پارہ ۸؍ محصول ڈاک فیس جسٹری ۳؍

اخبار مدینہ بجنور

ہفتہ میں دو بار

۱۹۱۲ء سے قابل اہل قلم اڈیٹرونکی زیر ادارت جاری ہے خدمت قوم و ملک یا سداری مذہب ملت اسکا شعار ہے آزادی طلب اور قومی مطالبا کا علمبردار اردو جرائد میں کثیر الاشاعت سیاست حاضرہ کا مفسر حق و صداقت کا مشتہر عربی و انگریزی اخبارات کا خلاصہ دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچنے والا ملاحظہ و مطالعہ خود ہمارے بیان کی تصدیق کردیگا۔ طلب فرمایئے

قیمت سالانہ ؎ ششماہی ؎ سہ ماہی ؎ فی پرچہ ؎ ممالک غیر سے آٹھ روپے سالانہ۔ نمونہ مفت۔

غنچہ رسالہ ہفتہ وار

بچوں کا معلم بچوں کا اتالیق، طالبعلموں کا اُستاد، علم و فن کا خزینہ، معلومات کی کان اخلاقیات و ادبیات کا گنجینہ، ہفتہ وار خاص ملک و ملت کے نونہالوں کیلئے مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوتا ہے زبان سلیس اور عام فہم ہے اپنے بچوں کیلئے ضرور طلب فرمایئے۔ قیمت سالانہ ؎ ششماہی ؎ نمونہ مفت

محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ و غنچہ بجنور

نرخنامہ اشتہار رسالہ ہمایوں

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ
۱۲	۴۸ روپے	۲۴ روپے
۶	۴۲ روپے	۲۲ روپے
۳	۲۱ روپے	۱۱ روپے
۱	۷ روپے	۴ روپے

اشتہار کی کاپی ارسال کرتے وقت اس نوٹ کو ملاحظہ فرمالیویں۔

نوٹ:- (۱) اجرت اشتہار پیشگی لی جاویگی (۲) فحش اور دل آزار اشتہار درج نہیں کیا جاویگا (۳)۔ اشتہارات کے چربے بھجوانے چاہئیں یا اگر خود کاتب سے نہ لکھوا سکیں تو عہ؍ کتابت کی اجرت کے علاوہ بھیجیں

منیجر رسالہ ہمایوں

پتہ صاف خوشخط اور خریداری نمبر لکھوا کر ضرور دیا کریں

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

کف و کھانسی کی دوا

کھانسی ام الامراض ہے یہ مثل بالکل درست ہے کیونکہ کھانسی کی وجہ سے مختلف مرض پیدا ہوتا ہے سردی سے ابتدا میں کھانسی ہوتی ہے۔ اگر بروقت علاج نہ کیا گیا تو سانس کی نلیوں میں بلغم جمع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ دم کی گھٹ اور پسلیوں میں درد۔ بخار۔ دق سل۔ مراق وغیرہ مختلف امراض میں مریض مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہذا سردی یا کھانسی شروع ہوتے ہی مناسب دوا استعمال کرنا لازم ہے۔ ایسے مہلک مرض کا قلع قمع کرنے کے لئے ڈاکٹر ایس کے برمن کی ایجاد کردہ "کف و کھانسی کی دوا" از حد مفید ہے۔ وقت ضرورت کے لئے ہر گھر میں اس کی ایک شیشی موجود رکھنی چاہیئے قیمت فی شیشی کلاں عہ ایک روپیہ چار آنہ۔ خورد ۱۰ دس آنہ محصولڈاک و پیکنگ ۸ آٹھ و چھ آنہ۔

دمہ دم کے ساتھ ہے یہ بات صریح غلط ہے

کیونکہ ڈاکٹر برمن کی ایجاد کردہ "دمہ کی دوا" عرصہ ۴۲ سال سے ہندوستان کے ہر حصہ میں شہرت کیساتھ مفید ثابت ہوئی اور لاکھوں مریض ہر سال شفا پا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مریض بازاری زیادہ تر نشیلی اجزا دھتورہ۔ بھنگ۔ بلاڈونا۔ پوٹاس وغیرہ مضر اشیاء آمیز دوا استعمال کر کے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھا کر مایوس ہو بیٹھتے ہیں اور عمر غیر طبعی میں مارے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کی کیمیائی اصول سے بنائی ہوئی "دمہ کی دوا" ایک بیش قیمت جوہر ہے اس کی ایک ہی خوراک سے دمہ موقوف ہو جاتا ہے اور کچھ روز کے استعمال سے جڑ سے نابود ہو جاتا ہے اور کبھی دمہ کا دورہ نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ آزما کر دیکھئے۔
قیمت فی شیشی عہ ایک روپیہ آٹھ محصولڈاک چھ آنہ ۶/۔

مفصل حال دریافت کرنے کے لئے بڑی فہرست مفت منگا کر دیکھئے

نوٹ:۔ ہماری دوائیں ہر جگہ ہر ایک دوکاندار اور ہمارے ایجنٹوں کے پاس ملتی ہیں دوا منگانے سے پہلے آپ اپنے مقام کے دوکانداروں سے دریافت کیجئے

ڈاکٹر ایس کے۔ برمن (پوسٹ بکس ۵۵۴) نمبر ۵ تارا چند دا سٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ:۔ مینیجر پیسہ اخبار لاہور

قواعد

۱۔ ہمایوں بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی، ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۲/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر ۷۲ صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے
اسکے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۲/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ نمونہ ۱۰/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۳۰۔ لارنس روڈ۔ لاہور

منشی علم دین مینیجر رسالہ ہمایوں
نے
باہتمام لالہ دیوان چند صاحب مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا